الرسالہ

سرپرست

مولانا وحید الدین خاں

تارکول کی چکنی سڑک پر نئی کار تیزی سے پھسل رہی تھی۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے ایک کسان ٹریکٹر کی پیٹھ پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ ٹیلوں اور کھائیوں کو ہموار کر رہا تھا تاکہ اس کو فصل اگانے کے قابل بنائے۔ کار کے لئے کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا جب کہ ٹریکٹر کو جگہ جگہ ٹھوکر لگ رہی تھی۔ اس کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔

کار کے مقابلہ میں ٹریکٹر کی یہ حالت کسی بھی درجہ میں اس کی اہمیت کو نہیں گھٹاتی — کار بنے بنائے راستہ پر دوڑ رہی ہے، جب کہ ٹریکٹر خود اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ ایک ماضی میں سفر کر رہا ہے، دوسرا مستقبل کی طرف مارچ کر رہا ہے۔ ایک تاریخ کے اندر گم ہے، دوسرا اپنی جدوجہد سے خود ایک تاریخ بنا رہا ہے۔

ٹریکٹر کی سست رفتاری میں جو عظمتیں چھپی ہوئی ہیں، اس کے مقابلہ میں کار کی تیز رفتاری کی کوئی حقیقت نہیں۔

شمارہ ۸	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے۔ فی پرچہ دو روپیہ	جولائی ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

الرسالہ کا دفتر تبدیل ہوگیا ہے۔ براہ کرم تمام خطوط
اور رقوم وغیرہ درج ذیل پتہ پر روانہ کریں ۔

ماہنامہ الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

اداریہ

الرسالہ جون کے مہینے میں شائع نہ ہو سکا۔ ممکن ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہو۔ اس لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ قارئین الرسالہ اپنی خریداری کی مدت کو مہینوں کے اعتبار سے شمار نہ فرمائیں بلکہ الرسالہ کی موصولہ تعداد کے اعتبار سے شمار کریں۔ ایک خریدار جس نے سالانہ زرتعاون جمع کیا ہے، اس کی مدت خریداری رسالہ کے بارہ شماروں پر ختم ہوگی۔ خواہ وہ بارہ مہینوں میں پوری ہو یا اس سے زیادہ مہینوں میں۔

الرسالہ کی اشاعت میں وقفہ بلاشبہ ایک حادثہ ہے مگر بعض حادثات اپنے اندر بھلائی کا پہلو لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کے لئے یہ حادثہ اسی قسم کی ایک بھلائی کا سبب بن گیا۔ الرسالہ کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مسلسل سات شمارے نکلنے کے بعد اچانک بلا اعلان جون ۱۹۷۷ کا شمارہ نہ پہنچنا قارئین کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔ فطری طور پر دفتر کو استفسار کے خطوط ملنے شروع ہوئے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ صرف ایک خط کو چھوڑ کر کسی نے بھی ہم کو سخت خط نہیں لکھا۔ بلکہ بعض لوگوں نے ہمیں تسکین دلائی کہ اگر ایک دو مہینے کسی وجہ سے پرچہ نہ نکلے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس قسم کے مقصدی پرچوں میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

ایک صاحب کو جب وقت پر رسالہ نہیں ملا تو ہم کو خفگی کا خط لکھنے کے بجائے انھوں نے خود اپنے آپ کو متحرک کر دیا۔ وہ اپنی مصروفیات کے باوجود سفر پر نکل پڑے تاکہ اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے الرسالہ کے لئے تعاون جمع کریں۔ انھوں نے ہم کو صرف اس وقت خط لکھا جب کہ وہ الرسالہ کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر چکے تھے۔

یہ واقعات ہمارے قارئین کی شعوری پختگی کا ثبوت ہیں۔ اجتماعی زندگی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف شکایت کے بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے دوسرے کے سلسلے میں اپنا حصہ ادا کرنے میں لگ جائیں۔

اگر یہ مزاج ہو تو کسی کے لئے یہ سمجھنا بالکل مشکل نہیں کہ الرسالہ جیسے جریدہ کی اشاعت میں بے قاعدگی عین باقاعدگی ہے۔ حالات سے موافقت کی بنیاد پر نکلنے والے پرچوں کے لئے جو چیز "کارنامہ" شمار ہوتی ہے وہ حالات کے خلاف جاری ہونے والے پرچوں کے یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ ایک کا پانا دوسرے کے لئے کھونا ہے۔ اول الذکر کے یہاں جو چیز محرومی ہے، ثانی الذکر کے لئے وہ یافت کے خانہ میں لکھی جاتی ہے۔

اگر ہم کو ایسے قارئین مل گئے ہیں جو الرسالہ کی صحافتی مہم میں "بے قاعدگیوں" کو دیکھنے کے بعد یہ کہہ سکیں کہ یہ تو وہی ہے جس کے لئے ہم پہلے سے اپنے کو تیار کئے ہوئے تھے (ھذا ما وعدنا......، احزاب ـ ۲۲) تو شاید ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوںگے کہ الرسالہ نے آدھی کامیابی حاصل کر لی۔

رحمت خداوندی کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی کمزوریوں میں قوت کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ان کی ناکامیوں کو کامیابی کے زینے بنا دیتا ہے۔ یہ معاملہ ان خاص بندوں کے لئے ہے جو اپنی ذات کے مدار سے نکل آئیں اور صرف حق کے گرد گھومنے لگیں۔ (وحیدالدین)

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں

اسلامی غلبہ سے پہلے عراق قدیم ساسانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ ۱۴ھ میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں لشکر اسلام عراق کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف ساسانی فوج کا سردار رستم تھا۔ جنگ سے پہلے، مختلف اسلامی سفرا رستم کے دربار میں بات چیت کے لئے گئے۔ انھیں میں سے ایک ربعی بن عامر بھی تھے۔ رستم نے ربعی بن عامر سے پوچھا: تم کو کیا چیز یہاں لے آئی ہے۔ انھوں نے جواب میں جو تقریر کی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة اللہ ومن ضیق الدنیا الی سعتھا ومن جور الادیان الی عدل الاسلام فارسلنا بدینہ الی خلقہ لندعوھم الیہ (ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۷، صفحہ ۳۸)

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے کہ جس کو وہ چاہے، بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔ دنیا کی تنگی سے اس کی فراخی کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ پس اس نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔ ❋

ہم کس بات کی گواہی دے رہے ہیں

مغلوں کے مقابلہ میں جب مرہٹے اور سکھ ابھرے تو مسلمان ان کے خلاف بھڑک اٹھے۔ بعد میں سے انگریز آکر ملک کے اوپر قابض ہو گئے تو ان کو ہٹانے کے لئے انھوں نے ساری دنیا میں ہنگامہ مچا دیا۔ کانگرس حکومت کے تحت ان کے ساتھ جبر و امتیاز کا سلوک ہوا تو اس کو انتخابی شکست دینے کے لئے ان کے درمیان زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا —— یہ ہے مسلمانانِ ہند کی دو سو سالہ سیاست کا خلاصہ۔ اس پوری مدت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خوف خدا اور فکر آخرت کو دعوتی مشن بنانے پر ان کے درمیان آگ بھڑکی ہو، آنے والے یوم الحساب کے مسئلہ سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے وہ بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ سیاسی مسائل اور اقتصادی مفادات کا معاملہ ہو تو فوراً ان کے اندر عمل کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ آخرت کے مفادات اور جنت اور جہنم کے مسائل اس سے کہیں زیادہ بڑے ہیں، مگر ان کی خاطر سرگرم ہونا وہ نہیں جانتے۔

مسلمان کا معاملہ عام قوموں سے مختلف ہے۔ وہ "شھداء اللہ فی الارض" ہیں۔ ان کو آخرت کے مسائل کی گواہی دینے پر مامور کیا گیا تھا۔ مگر وہ لوگوں کے سامنے دنیائے مسائل کی گواہی دینے میں سارا زور دکھا رہے ہیں۔ یہ الٹی گواہی نبی آخر الزماں کی امت کے لئے جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں بھی۔ اس قسم کی سرگرمیاں خدا کے غضب کو بھڑکانے والی ہیں نہ کہ اس کی رحمت و نصرت کو کھینچنے والی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم

ہم نے ایک ایسی چیز کے پیچھے اپنی عمر ضائع کر دی جس کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے، نہ آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہونے والا ہے

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں! ٹھیک ہی ہے میاں۔ مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی!

میں نے عرض کیا، حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں، جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی!

فرمایا: میں تم سے صحیح کہتا ہوں عمر ضائع کر دی!

میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں امام ابوحنیفہ رح کے مسائل کے دلائل قائم کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں، یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہ رح ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعی رح، مالک اور احمد بن حنبل رح اور دوسرے مسالک کے فقہا جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" (درست مسلک میں خطار کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطاء محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا:

ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطاء، اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں ہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ

صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی۔ قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا۔؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:

اللہ تعالیٰ نہ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہ کو، نہ مالک کو نہ احمد بن حنبل کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنھوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے۔ جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا۔ کہ وہاں میدان محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہ نے صحیح کہا تھا یا شافعی نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے، نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی۔ اپنی قوت صرف کردی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی۔ مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جارہی۔ یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے وہ پھیل رہے ہیں۔ گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آرہا ہے شرک و بت پرستی پھیل رہی ہے۔ حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے۔ لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کردی"۔ ✱

تمام انسان بنیادی طور پر ایک ہی قسم کا جسمانی ڈھانچہ رکھتے ہیں۔ تاہم کوئی بھی دو انسان بالکل ایک دوسرے کے مشابہ نہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ شخصی انفرادیت صرف آج کے لوگوں میں نہیں ہے۔ ہر وہ انسان جو کبھی اس زمین پر رہا ہے۔ مکمل طور پر ایک منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ ہر آدمی بے مثال اور ناقابل اعادہ ہے۔ یہی صورت حال مستقبل میں بھی باقی رہے گی۔

بے شمار شہادتوں سے ثابت ہوا ہے کہ انسان کے جسم اور ذہن میں پچھلے ایک لاکھ سال کے اندر کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ پتھر کے زمانہ میں انسانی جسم جس طرح قدرتی حالات کے تحت عمل کرتا تھا۔ آج بھی وہ ویسا ہی کرتا ہے اس پر، مثال کے طور پر، چاند کی گردش کا اثر پڑتا ہے۔ جیٹ جہاز جب تیزی سے اڑ کر ہم کو دن کے وقت رات کے لمحہ میں داخل کر دیتا ہے تو انسانی جسم میں عضویاتی کش مکش شروع ہو جاتی ہے ــــ اس طرح کے واقعات ارتقا پسند علماء کے تمام قیاسات کو باطل ثابت کرتے ہیں۔

دعوتِ اسلامی کے جدید امکانات

خدائی پیغام رسانی کا کام، انسانیت کے آغاز سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک، پیغمبروں کے ذریعہ ہوا ہے۔ نبوت کی سطح پر اس کام کی انجام دہی کا یہ فائدہ تھا کہ اس کو معجزاتی تائید کی قوت حاصل رہتی تھی۔ نبی جب اپنی مدعو قوم کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتا تو اس کے ساتھ وہ ایسے معجزات پیش کرنے پر قادر ہوتا جو اس کی دعوت کی صداقت پر غیر معمولی برہان بن سکیں۔

ختم نبوت کے بعد یہ صورت حال ہوگئی کہ دعوت کی ذمہ داری تو بدستور اپنی پوری شدت کے ساتھ باقی ہے۔ مگر دعوت کے حق میں معجزاتی تائید کا وعدہ باقی نہیں رہا۔ ایک حکومت جب کسی کو فارسٹ افسر مقرر کرتی ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس کو ضروری اسلحہ بھی دیتی ہے تاکہ جنگل میں درندوں کے متوقع حملہ کے وقت وہ اپنا دفاع کر سکے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ وہ ہستی جو ساری رحمتوں کا خزانہ ہے وہ اس پہلو کو بھول جائے، وہ ہم کو ذمہ داری سونپ دے مگر ہماری ضرورتوں کا انتظام نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعد کو آنے والے داعیوں کے لئے اللہ نے ایسا انتظام کیا جو پچھلے تمام انتظامات سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ اللہ نے اس مقصد کے لئے خود انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا تاکہ دعوتی مشن کے حق میں وہ تائید ہم کو معمولی حالات میں مل جائے جس کو پچھلے لوگ صرف غیر معمولی حالات میں پانے کی توقع کر سکتے تھے۔ اگرچہ موجودہ دور میں ہم اس راز کو سمجھ نہ سکے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔

قرآن میں شرک کو ظلم عظیم (۳۱ : ۱۳) کہا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل توحید کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ وہی کُل صداقت ہے (۱۰ : ۳۲)۔ قدیم ترین زمانہ سے انسانی زندگی کا نظام شرک کی بنیاد پر قائم چلا آرہا تھا۔ تمام پیغمبر جو خدا کی طرف سے آئے، وہ اسی لئے آئے کہ انسان کو شرک کی برائیوں سے آگاہ کریں اور توحید کی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کریں تاکہ انسان کے اوپر دنیا اور آخرت کی کامیابیوں کا دروازہ کھل سکے۔ مگر قوموں نے پیغمبروں کی بات چلنے نہ دی۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پیغمبر ہیں جن کو خدا کی خصوصی نصرت کے تحت یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ انھوں نے شرک کو مقام اقتدار سے ہٹا دیا اور توحید کی بنیاد پر ایک مکمل انقلاب پیدا کر دیا (وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ) یہ انقلاب جو ساتویں صدی عیسوی میں ظہور میں آیا، اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس نے تاریخ انسانی میں پہلی بار مظاہر کائنات کے تقدس کو ختم کر دیا اور انسانیت کے لئے اُس مادی نعمت کے ظہور کی راہ ہموار کی جس کو جدید سائنس کہا جاتا ہے۔

تہذیب جدید کے مورخین کے سامنے ایک سوال یہ رہا ہے کہ فطرت کے خزانے اول دن سے زمین کے اوپر موجود تھے۔ انسان کے اندر ضروری ذہنی صلاحیت بھی قدیم ترین زمانہ سے پائی جاتی رہی ہے۔ پھر اس خزانہ کو انسانی تمدن کے لئے استعمال کرنے میں اتنی دیر کیوں لگی۔ انسان لاکھوں برس سے زمین کے اوپر آباد ہے۔ مگر زمین کے قدرتی خزانوں کو موجودہ شکل میں استعمال کرنے کی تاریخ صرف چند سو برس پیچھے تک جاتی ہے۔ مورخ آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۸۹۔۱۹۷۵) نے بجا طور پر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قدیم زمانہ کا انسان زمین کو دیوتا سمجھتا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اس کے لئے خدا کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ان کو دیکھتا تو ان کے بارے میں اس کے اندر تقدس اور پرستش کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ اس نفسیاتی فضا میں زمینی ذرائع کو انسانی خدمت کے لئے استعمال کرنے کا جذبہ نہیں ابھر سکتا تھا۔ ٹائن بی کے الفاظ میں یہ توحید (MONOTHEISM) کا عقیدہ ہے جس نے کائنات کے تقدس کو ختم کیا اور ہر چیز کو ایک خدا کی مخلوق بتایا۔ اس طرح وہ نفسیاتی فضا پیدا ہوئی جس میں انسان اپنے سیارہ کو دیوتا سمجھنے کے بجائے اپنا خادم سمجھے اور اس پر تصرف کا عمل کر سکے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مارچ ۱۹۷۴)

کائنات کو تسخیر و تدبر کا موضوع سمجھنے کا ذہن اولاً اسلام کے اثر سے عربوں میں پیدا ہوا۔ اس فکری انقلاب کا ایک دھارا وہ تھا جس کا مرکز سسلی اور اسپین بنا۔ ان ملکوں میں، غلبۂ توحید کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر، سائنسی کھوج اور زمینی خزانوں کو استعمال کرنے کا ذہن ابھرا اور بالآخر ایک عظیم الشان تہذیب وجود میں آگئی۔ یہی عرب تہذیب تیرھویں صدی سے اٹلی کے راستہ یورپ پہنچنا شروع ہوئی اور بڑھتے بڑھتے بالآخر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے انقلاب کا سبب بنی۔ جدید مورخین نے عام طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا سبب اول (FIRST CAUSE) نبی عربی کے پیروؤں کے وہ کارنامے تھے جو انھوں نے اسپین کی حکومت (۷۱۱۔۱۴۹۲) کے زمانہ میں دکھائے۔

بریفالٹ (BRIFFAULT) نے لکھا ہے "اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثرات موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یعنی سائنس اور سائنسی طرز فکر" اس کے بعد اس کے الفاظ یہ ہیں:

IT IS HIGHLY PROBABLE THAT BUT FOR THE ARABS, MODERN INDUSTRIAL CIVILISATION WOULD NEVER HAVE ARISEN AT ALL
Making of Humanity, P. 202

انتہائی اغلب ہے کہ عربوں کے بغیر جدید صنعتی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہ آتی۔

کائناتی تقدس ختم ہونے کا یہی نتیجہ نہیں ہوا کہ عالم طبیعی کے بارے میں انسان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ انسانی تعلقات کے تمام شعبے بھی اس سے انتہائی گہرائی کے ساتھ متاثر ہوئے۔ مشرکانہ نظام کے تحت جس طرح یہ ہوا تھا کہ طبیعی دنیا میں جو چیز زیادہ روشن اور نمایاں نظر آئی اس کو خدا سمجھ لیا گیا، اسی طرح انسانی عظمتوں کے بارے میں بھی فوق الفطری عقیدے قائم ہو گئے۔ بادشاہ دیوتاؤں کی اولاد قرار پائے۔ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ خدا کا خصوصی رشتہ فرض کر لیا گیا۔ جس

انسان کے اندر کوئی بڑائی نظر آئی اس کے متعلق یقین کر لیا گیا کہ اس کو کوئی خاص آسمانی حیثیت حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

اسلامی انقلاب کے بعد جب شرک کا نظام ٹوٹا اور توحید کو غلبہ حاصل ہوا تو انسانی عظمتوں کو فوق الفطری معتقدات سے وابستہ کرنے کا ذہن بھی ختم ہوگیا۔ اب سارے انسان ایک خدائے برتر کی یکساں مخلوق قرار پائے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں فرق کرنے کی وہ بنیاد باقی نہ رہی جس کی وجہ سے تاریخ کے نامعلوم زمانوں سے انسانیت اونچ نیچ میں مبتلا چلی آرہی تھی۔ انسان اپنے حقیقی شرف سے محروم تھا۔ پیغمبر اسلام نے توحید کی بنیاد پر جو انقلاب برپا کیا، اس نے خدا کی برتری اور اس کے مقابلہ میں سارے انسانوں کی یکسانیت اس طرح ثابت کی کہ قدیم روایتی نظام بالکل ٹوٹ کر رہ گیا۔ انسانیت ایک نئے راستہ پر چل پڑی۔ لوگوں کے عقائد بدل گئے۔ پیشوائی اور سرداری کا سابقہ نظام درہم برہم ہوگیا۔ وہ شہنشاہتیں زمیں بوس ہوگئیں جو فوق الفطری عظمتوں کا یقین دلا کر لوگوں کے اوپر حکومت کر رہی تھیں۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار اس تبدیلی کا آغاز ہوا جو ساری دنیا میں ایک نئے انسانی دور کا آغاز بنا۔

روسو (۱۷۷۸ — ۱۷۱۲) نے اپنی کتاب اس مشہور فقرہ سے شروع کی ہے:

"انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں"

یہ فقرہ درحقیقت خلیفہ ثانی عمر فاروق (۶۴۴ — ۵۸۱) کے اس فقرہ کی بازگشت ہے جو انھوں نے روسو سے گیارہ سو برس پہلے محض ایک خیالی نظریہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ریاست کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے ماتحت افسر سے کہا تھا:

متی عبّدت الناس وقد خلقتهم امهاتهم احرارا — تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا۔

تاریخ انسانی کو پیغمبر اسلام کی اس دین کا اعتراف غیر مسلم محققین نے عام طور پر کیا ہے۔ ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا (کلکتہ یونیورسٹی) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> MODERN HISTORY ATTRIBUTES LIBERTY, EQUALITY AND FRATERNITY TO BE THE OUTCOME OF THE FRENCH REVOLUTION, BUT THE FIRST PERSON TO PROCLAIM IT WAS THE FOUNDER OF ISLAM FOURTEEN CENTURIES AGO.
>
> Illustrated Weekly of India, April 15, 1973

جدید تاریخ آزادی، مساوات اور اخوت کو فرانسیسی انقلاب کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔ مگر پہلا شخص جس نے اس کا اعلان کیا وہ اسلام کے بانی تھے جو چودہ سو سال پہلے پیدا ہوئے۔

یہ واقعات جو عالم طبیعی اور عالم انسانی میں پیش آئے، یہ دراصل توحید کے پیدا کردہ انقلاب کے دنیوی نتائج تھے۔ امریکہ سے ایک انسائیکلو پیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے: "مین اینڈ ہز گاڈس"۔ اس میں مختلف مذاہب پر مقالے ہیں۔ اسلام پر جو مقالہ ہے اس کے عیسائی مقالہ نگار نے اسلامی انقلاب کے ان نتائج کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

ITS ADVENT CHANGED THE COURSE OF HUMAN HISTORY (P.389)

اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا گیا، وہ اگرچہ اصلاً توحید اور آخرت پر مبنی ایک انقلاب تھا۔ مگر اس نے بہت سے دور رس دنیوی نتائج بھی پیدا کئے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے دنیوی نتائج میں سب سے اہم وہ نتائج ہیں جنھوں نے قدیم زمانہ کے سماجی اور اجتماعی نظام کو اس طرح بدل دیا کہ وہ حالات ہی ختم ہوگئے جن میں دعوت حق کا کام ایک انتہائی مشکل کام بن گیا تھا۔ اب دعوت حق کا وہ کام ایک سادہ اور آسان کام بن چکا ہے جس کے لئے اٹھنے والوں کو قدیم زمانہ میں فرعون کے اس چیلنج کا سامنا کرنا پڑا تھا:

میں تمھارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ (شعراء - ۴۹)

اسی طرح اس انقلاب نے قدیم زمانہ کے اس فکری ڈھانچہ کو بدل دیا جس نے قیاسات اور توہمات کو علم کا درجہ دے رکھا تھا۔ کائنات میں چھپی ہوئی خدائی تصدیقی نشانیاں لوگوں کے سامنے آگئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت حق کا وہ کام جس کے لئے اس سے پہلے معجزاتی استدلال کی ضرورت ہوتی تھی، اب ممکن ہوگیا ہے کہ خود علم انسانی کے ذریعہ اس کو ثابت اور مدلل کیا جا سکے۔

تاریخ کا رخ موڑنے کا یہ عمل جو ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، موجودہ زمانہ میں وہ اپنی آخری انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ خدا کے دین کی خاطر کام کرنے والوں کے لئے اب خود انسانی اسلحہ خانہ میں ہر قسم کے تائیدی ذرائع موجود ہیں۔ قانونی اور سماجی انقلابات نے اب اس کا موقع دے دیا ہے کہ دعوت اسلام کا کام اس طرح کھلے میدان میں کیا جائے جہاں کوئی فرعون اور کوئی نمرود راستہ روکنے کے لئے موجود نہ ہو۔ حقائق کی دنیا جو اب انسان کے علم میں آئی ہے وہ نہ صرف تمام دوسرے ادیان کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے بلکہ مثبت طور پر اس نے دین حق کی صداقت پر تمام دلائل جمع کر دیئے ہیں۔

یہ ایک نہایت وسیع مضمون ہے۔ تاہم اس خاص پہلو سے یہاں ہم اس انقلاب کے بعض نتائج کا ذکر کریں گے

۱۔ سیاسی ادارہ کو فوق الفطری معتقدات سے جدا کرنا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار ہزار برس پہلے قدیم عراق کے دارالسلطنت (اُر) کے لوگوں کو پکارا کہ صرف ایک خدا ہے جو نفع وضرر کا مالک ہے۔ ان باتوں میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس لئے تم اسی سے حاجتیں مانگو اور اسی کی پرستش کرو۔ اس دعوت توحید کے خلاف اس وقت کے مشرک بادشاہ نمرود کلدانی نے اتنا شدید ردعمل ظاہر کیا کہ آپ کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔ آج بھی ہندستان میں شرک کا عقیدہ بڑے پیمانہ پر پایا جاتا ہے۔ لیکن آج آپ یہاں دعوت ابراہیمی کو لے کر اٹھیں تو نئی دہلی کے حکمراں آپ کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کریں گے۔

اس کی وجہ زمانی تبدیلی ہے۔ نمرود کے زمانہ میں شرک ایک سیاسی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کہ آج وہ صرف ایک محدود مذہبی عقیدہ ہے۔ نمرود، قدیم زمانہ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح، لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر ان کے اوپر حکومت کر رہا تھا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے اس کو حکمرانی کا فوق الفطری حق حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ اس کے برعکس ہندستان کے موجودہ حکمرانوں کے نزدیک اس قسم کے کسی عقیدہ کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں۔ انھوں

نے عوامی ووٹوں کی بنیاد پر حکمرانی کا حق حاصل کیا ہے نہ کہ کسی فوق الفطری عقیدہ کی بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت میں ان کو اپنے سنگھاسن کے لئے کوئی راست نظریاتی خطرہ نظر نہیں آتا، جبکہ نمرود کو اس قسم کے کسی عقیدہ کے پھیلنے میں اپنی سیاسی جڑ کٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

قدیم زمانہ میں جب کوئی نبی اٹھتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ پہلے ہی مرحلہ میں اقتدار وقت سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا اور غیر ضروری قسم کی مشکلات اس کی راہ میں حائل ہو جاتیں۔ اس کی وجہ سیاسی اداروں کے ساتھ فوق الطبیعی عقائد کی یہی وابستگی تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ عوام کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، خدا ان کے اندر حلول کر آیا ہے۔ ایسے ماحول میں جب توحید خالص کی آواز بلند ہوتی تو ان کو نظر آتا کہ وہ ان کے سیاسی استحقاق کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ یہ اعتقادی پیچیدگی ان کو داعئ حق سے متصادم کر دیتی تھی۔

اسلام نے ثابت کیا کہ ہر قسم کا فوق الفطری اقتدار صرف خدا کے لئے ہے اور یہ اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام نے سیاسی ادارہ کو اعتقادیات سے جدا کر دیا۔ اب سیاسی حکمرانی صرف سیاسی حکمرانی تھی، وہ مسئلہ توحید سے کوئی براہ راست تعلق نہ رکھتی تھی۔

اسلام کی اس فکر کی بنیاد پر عرب میں جو انقلاب آیا، وہ ایشیا اور افریقہ ہوتا ہوا بالآخر یورپ پہنچا۔ اٹھارویں صدی میں فرانس اور امریکہ کے جمہوری انقلابات اسی کی بازگشت تھے۔ اس کے بعد تبدیلی کا یہ عمل آخری طور پر مکمل ہو گیا۔ اب وہ وقت اپنی کامل صورت میں آ گیا کہ ایک داعی توحید کی دعوت لے کر اٹھے اور سیاسی اعتقادیات کی پیچیدگی میں الجھے بغیر بندگان خدا کو حق سے آگاہ کرتا رہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص عوام میں یہ بات مشہور کر کے اپنا طبی کاروبار چلا رہا ہو کہ وہ ایک جن ڈاکٹر کا شاگرد ہے جو روزانہ رات کو آ کر اس کو فن طب کے رموز بتا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی شخص یہ آواز بلند کرے کہ علم طب میڈیکل کالج میں سیکھا جاتا ہے نہ کہ جناتوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو مذکورہ طبیب ایسی تحریک کا سخت مخالف ہو جائے گا۔ جب کہ اسی بستی میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو اس تحریک سے کوئی عداوت نہ ہوگی۔

۲۔ اظہار رائے کی آزادی

دنیوی عظمتوں کو فوق الطبیعی سمجھنے ہی کا یہ نتیجہ بھی تھا کہ قدیم زمانہ میں عام افراد کو رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ ایک شخص کی زبان قانون ہوتی تھی۔ اسلام نے جب غیر اللہ کے لئے فوق الطبیعی عظمتوں کے تصور کو منہدم کیا تو ساری دنیا میں ایک نیا عمل شروع ہو گیا۔ اگرچہ انتہائی خلاف زمانہ تصور ہونے کی وجہ سے اس عمل کی تکمیل میں ایک ہزار برس لگ گئے۔ تاہم وہ چیز جو قدیم زمانہ میں ایک مسلّمہ حقیقت سمجھی جاتی تھی آج وہ اتنی بے دلیل ہو چکی ہے کہ ساری دنیا میں کوئی اس کی وکالت کرنے والا نہیں۔

جاپان کی تاریخ اس سلسلے میں بڑی سبق آموز مثال پیش کرتی ہے۔

سولھویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی مذہب پرتگیزیوں کے ذریعہ جاپان میں داخل ہوا اور ملک

میں پھیلنے لگا۔ یہ بادشاہت کا زمانہ تھا۔ ۱۶۱۲ء میں ایک شاہی فرمان جاری ہوا جس کے مطابق عیسائیت اور اس کی تبلیغ کو جاپان میں خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ دو سو برس تک اس فرمان پر انتہائی بے رحمی کے ساتھ عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ عیسائیت کو جاپان سے بالکل ختم کر دیا گیا۔

مگر اسی مدت میں ایک اور عمل جاری تھا۔ اسلام نے تاریخ انسانی کو جو دھکا دیا تھا، وہ یورپ میں داخل ہو کر اٹھارویں صدی میں اپنی آخری سیاسی انتہا کو پہنچ گیا۔ فرد کی آزادی اور اظہار رائے مسلّمہ انسانی حق قرار پائے۔ یہ افکار جو اولاً فرانس میں مرتب ہوئے انھوں نے ساری دنیا پر اپنے اثرات ڈالنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ جاپان کو ۱۸۷۳ء میں خلاف مسیحیت قانون کو منسوخ کرنا پڑا اور ہر ایک کے لئے اظہار رائے کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔

اس زمانی تبدیلی نے دین کی دعوت و تبلیغ کے تمام راستے کھول دیئے ہیں۔ اب ساری دنیا میں دین خداوندی کا اعلان کیا جا سکتا ہے اور کہیں بھی داعی کی زبان و قلم پر کوئی پابندی لگانے والا نہیں ہوگا۔ تاہم اس امکان کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں کہ ہم خود اپنی نادانی کی وجہ سے دوبارہ کسی نئے عنوان سے فرضی مسائل اسلام کی راہ میں کھڑے کر دیں جن کو خدا نے اسلام کی راہ سے ہٹا دیا تھا۔ کوئی بھی انتظام، خواہ کتنا ہی اعلیٰ پیمانہ کا ہو، کسی کے لئے اس قسم کی نادانی کے امکان کو بند نہیں کرتا۔

■ ۴۔ مظاہر فطرت کو تسخیر و تدبر کا موضوع بنانا

کائناتی مظاہر پچھلے تمام معلوم زمانوں سے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ اسلام نے پہلی بار ان کو تسخیر و تدبر کا موضوع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ جب تک آدمی ان کو خدا سمجھتا تھا وہ ان کے آگے جھکتا رہا۔ جب اس نے جانا کہ یہ سب مجبور اور مخلوق ہیں تو اس نے ان کو سمجھنے کے لئے تحقیق شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم فطرت آدمی کے سامنے کھلنے لگے۔ خدا نے اپنی تخلیقات میں جو تصدیقی نشانیاں رکھ دی تھیں وہ ایک ایک کر کے ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں پہنچ کر اب وہ وقت آگیا ہے جس کی پیشگی اطلاع قرآن میں ان لفظوں میں دی گئی تھی: ہم ان کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔"
یہ پیشین گوئی اتنے بڑے پیمانہ پر واقعہ بن چکی ہے کہ جو باتیں ماضی کے انسان کے لئے ایمان بالغیب کی حیثیت رکھتی تھیں، آج وہ اس کے لئے ایمان بالشہود کے درجہ پر پہنچ چکی ہیں۔

قدیم زمانہ کا انسان فطرت کو سادہ واقعات کا مجموعہ سمجھتا تھا، آج معلوم ہوا کہ وہ بے حد پیچیدہ اور انتہائی حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کا نظام اتنی محکم بنیادوں پر چل رہا ہے کہ ایک عظیم کارساز کو مانے بغیر اس کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں۔ قدیم فلاسفہ یہ کہتے تھے کہ خدا جیسے ایک ازلی وجود کو ماننے کے بجائے ہم کیوں نہ اسی کائنات کو ازلی مان لیں۔ مگر جدید تحقیقات (مثال کے طور پر بگ بینگ نظریہ) نے اس نقطۂ نظر کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ دنیا ایک وقت خاص میں پیدا کی گئی۔ گویا اب ایک ازلی و ابدی خالق کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات کے اندر جو مختلف طبیعی، کیمیاوی اور حیاتیاتی مظاہر ہیں، ان کو بہت سی الگ الگ

فطری طاقتیں کنٹرول کر رہی ہیں۔ نیوٹن کے بعد ان طاقتوں کی گنتی تین تک آگئی: تجاذب، مقناطیسیت اور نیوکلیر فورس۔ مگر حال میں ایٹم کے اندر جو جادوئی ذرہ (CHARMED PARTICLE) دریافت ہوا ہے، اس کے بعد تعدد کا نظریہ ختم ہو گیا۔ اب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک ہی متحدہ طاقت ہے جو فطرت کے تمام عملوں کی ذمہ دار ہے۔ گویا شرک کے حق میں علمی بنیاد ختم ہو گئی اور اب توحید کے سوا کوئی راستہ انسان کے لئے باقی نہیں رہا۔ زندگی بعد موت جس کو پہلے ناقابل ثبوت سمجھا جاتا تھا، اب اس کا سائنسی ثبوت فراہم ہونے لگا ہے۔ حتیٰ کہ غیر مذہبی علماء آج ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جن کا ٹائٹل ہوتا ہے: زندگی کے بعد زندگی (LIFE AFTER LIFE)

۴۔ غیر علمی طرز فکر کا خاتمہ

پچھلے تمام زمانوں میں غیر علمی یا توہماتی طرز فکر دنیا کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ اس طرز فکر کا خاصہ ہے کہ وہ کسی بات کی گہری جانچ کئے بغیر اس کو مان لیتا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس غیر علمی طرز فکر نے لوگوں کو یہ موقع دے رکھا تھا کہ وہ آسانی سے اپنے لئے کوئی نہ کوئی ذہنی پناہ گاہ تلاش کر لیں جہاں وہ دین حق سے بھاگ کر چھپ سکیں۔ فتح مکہ کے بعد جب کعبہ سے بتوں کو نکال کر توڑا جانے لگا تو اسلام کا یہ غلبہ دیکھ کر مکہ کے بت پرستوں کو فوراً توبہ کر لینی چاہئے تھی۔ مگر انھوں نے یہ کیا کہ وہ بستی چھوڑ کر پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ ان کا یقین تھا کہ اب ضرور مکہ پر کوئی آفت آئے گی اور مسلمانوں کے استیصال کا جو کام وہ خود نہ کر سکے وہ ان کے بت انجام دے دیں گے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر بتوں کے اندر طاقت ہوتی تو وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہی کیوں ہونے دیتے۔

سائنسی انقلاب دراصل توہماتی طرز فکر کے بجائے واقعاتی غور و فکر کا نام تھا۔ کائنات کا نظام چونکہ انتہائی اٹل بنیادوں پر چل رہا ہے۔ اس لئے فطری طور پر کائناتی علم کی ترقی نے تجزیاتی استدلال اور حقیقت پسندانہ تحقیق کا مزاج پیدا کیا۔ قدیم زمانہ میں لوگوں کو اپنی توہم پرستی اور غیر علمی انداز فکر کی وجہ سے ایک غیر واقعی بات کو مان لینے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی تھی۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ ایک بے بنیاد عقیدہ کو اس طرح اپنے ذہن میں جگہ دے سکتے تھے گویا وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہے۔ مگر آج کا انسان حقیقت واقعہ سے کم تر سطح پر کسی چیز کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس ذہنی فضا نے تاریخ میں پہلی بار تمام دروازے صرف دین حق کے لئے کھول دیئے ہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی دین نہیں جو واقعاتی تجزیہ اور حقیقت پسندانہ جانچ کے معیار پر پورا اتر سکے۔

یہ نئی زمین جو اسلام کے حق میں تیار ہوئی ہے، مسلمان خود تو ابھی بہت کم اس سے فائدہ اٹھا سکے ہیں۔ البتہ اس سے پیدا شدہ ثمرات ان کو ملنا شروع ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہی چیز ہے جس نے اسلام کے مطالعہ کے لئے قدیم طرز کے استشراق کا خاتمہ کر دیا۔ صلیبی لڑائیوں کے بعد مسیحی یورپ نے اسلام کی تاریخ اور اس کی تعلیمات کو بالقصد بگاڑنا شروع کیا۔ صدیوں تک یہ کام جاری رہا۔ یہاں تک کہ سارا مغربی لٹریچر اس سے بھر گیا۔ سائنس کے ظہور سے پہلے لوگوں کو اس میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہ آتی تھی۔ مگر سائنس کے زور پر جو حقیقت پسندانہ طرز فکر پیدا ہوا، اس نے اس طریق مطالعہ کو بے معنی بنا دیا۔ قدیم استشراق کے خاتمہ کا یہ عمل ٹامس کارلائل (۱۸۸۱-۱۷۹۵) کے زمانہ

میں شروع ہوا اور اب بیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔

۵۔ افسانوی طرز فکر کے بجائے تاریخی طرز فکر

قدیم زمانہ میں روایت اور تاریخ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگ ایک بے اصل افسانہ کو بھی اسی طرح مانتے تھے جس طرح ایک ثابت شدہ تاریخی واقعہ کو ماننا چاہئے۔ سائنسی اور علمی نقطۂ نظر نے جب حقیقت پسندی کا ذہن پیدا کیا تو اس کے ساتھ فطری طور پر یہ ذہن بھی پیدا ہوا کہ انسانی واقعات کو مورخانہ انداز سے سمجھا جائے۔

تاریخی تحقیق کی یہ مہم مذہب تک بھی پہنچی اور وہ فن پیدا ہوا جس کو تنقید عالیہ (HIGHER CRITICISM) کہا جاتا ہے۔ اس شعبۂ تاریخ کے تحت جب مختلف مذاہب کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ دورِ قدیم کے سارے مذاہب تاریخی حیثیت سے غیر معتبر ہیں۔ اسلام کے بعد، تمام مذاہب میں، عیسائیت سب سے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ حضرت مسیح ؑ کے وجود کا کوئی تاریخی ریکارڈ آپ کی معاصر تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ آنجناب کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ وہ مختصر انجیلیں ہیں جن کا تاریخی استناد خود انتہائی طور پر مشتبہ ہے۔ مذاہب کی فہرست میں صرف اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ پروفیسر ہٹی کے الفاظ میں وہ تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوا WITHIN THE FULL LIGHT OF HISTORY۔ اس کی تمام چیزیں تاریخ کے معیار پر مکمل طور پر پوری اترتی ہیں۔ اسلام، پورے معنوں میں، ایک تاریخی واقعہ ہے نہ کہ غیر ثابت شدہ روایات کا مجموعہ۔

قدیم زمانہ میں تاریخی ثبوت کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ مگر آج کا انسان اس چیز کو قابل غور بھی نہیں سمجھتا جو مورخانہ معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔ اس صورت حال نے اسلام کو لوگوں کے لئے پرکشش بنانے کا اتنا بڑا میدان کھول دیا ہے جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھا۔

۶۔ آسمانی توجیہہ کی تلاش

خدا کو نہ ماننے والوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ زمینی واقعات کی توجیہہ خود زمین کے حالات میں تلاش کریں۔ مثلاً زندگی کو زمینی عناصر کے تعامل کا نتیجہ قرار دینا۔ مگر جدید شواہد نے اس قسم کی باتوں کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ اب سائنس داں مجبور ہو رہے ہیں کہ وہ زمینی واقعات کے لئے آسمانی توجیہہ تلاش کریں۔ مثلاً قدیم نظریہ ارتقاء کے بجائے اب پینس پرمیا (PANSPERMIA) کا نام لیا جانے لگا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی زمین پر خود بخود پیدا نہیں ہوگئی بلکہ بالائی خلا سے ہمارے اس کرہ پر بالقصد بھیجی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالائی خلا میں کسی مقام پر غالباً ہم سے زیادہ ترقی یافتہ "تہذیب" موجود ہے جس نے زمین پر زندگی کے جراثیم بھیجے ہیں۔

مزید یہ کہ فلکیات کے وسیع تر مطالعہ سے معلوم ہوا کہ "عالم بالا" ہم سے غیر متعلق اور بے عقل و بے شعور عالم نہیں ہے۔ ایسے قرائن معلوم ہوئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ خلا کے کسی مقام پر ہم سے زیادہ ذہین ہستیاں موجود ہیں۔ وہ اپنے اعلیٰ مواصلاتی ذرائع سے مسلسل ہماری زمین سے ربط رکھے ہوئے ہیں۔ حال میں ایک نیا شعبہ مطالعہ وجود میں آیا ہے جس کو ریڈیائی فلکیات (RADIO ASTRONOMY) کہا جاتا ہے۔ علم الافلاک کی اس نئی شاخ کا مقصد بالائی

خلا میں سگنل بھیجنا اور اوپر سے آنے والی ریڈیائی لہروں کا مطالعہ کرنا ہے۔ سائنسی حیثیت سے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے بہت سے ادارے وجود میں آئے ہیں جو مختلف تدابیر کے ذریعے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ زمین کے علاوہ کسی دوسرے کائناتی مقام پر جو اعلیٰ تر ذہنی ہستیاں پائی جاتی ہیں، ان سے ربط قائم کیا جائے ۔۔۔ ان کوششوں کا انجام خواہ جو بھی ہو، تاہم اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جدید انسان کے لئے خدائی الہام کا تصور اب ایسی مستبعد چیز نہیں رہا جس پر سوچنے کے لئے وہ تیار ہی نہ ہو سکتا ہو۔

فطرت کی دریافت اور کائنات کی تسخیر نے موجودہ زمانہ میں عیش و عشرت کے بے شمار نئے دروازے کھول دیئے۔ انسان نے ایسا شاندار تمدن بنایا جو معلوم تاریخ کے مطابق اس زمین پر کبھی نہیں بنا تھا اور آرام و راحت کے ایسے سامان فراہم کئے جو پہلے انسان نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

مگر ترقیوں کی انتہا پر پہنچ کر بالآخر انسان کو معلوم ہوا کہ موجودہ دنیا میں وہ زندگی نہیں بن سکتی جو خوف و حزن اور لغو اور تاثیم سے خالی ہو ۔۔۔ ترقیات نے فطرت کے حسین توازن کو توڑ دیا۔ بڑھاپا، بیماری اور موت پر قابو پانا ممکن نہ ہو سکا۔ حکومتی نظام اور قانونی ضوابط انسان کو نظم و ضبط کے دائرہ میں رکھنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئے۔ مشینی تہذیب کی کثافتوں نے خشکی و تری کو فساد سے بھر دیا۔ مادی ساز و سامان آدمی کو خوشی اور سکون نہ دے سکے۔ وغیرہ

اس تجربہ کے بعد ساری دنیا میں ایک نئی حرکت شروع ہوئی ہے۔ انسان مادیات سے اکتا کر غیر مادیات میں اپنی تسکین ڈھونڈ رہا ہے۔ خارجی دنیا سے واپس ہو کر وہ اپنی اندرونی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے اس کوشش نے مذہب اور نفسیات کے علم کو بالکل نئی اہمیت دے دی ہے۔ آج کا انسان دوبارہ اس مقام پر واپس آگیا ہے جہاں اس کو خدا اور مذہب کی باتیں بتائی جائیں اور وہ ان کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرے۔ قدیم زمانہ میں تھوڑے سے "حنیف"، تھے جو سچائی کی تلاش کر رہے تھے۔ آج دنیا کی دنیا سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہے

یہ ذہنی زمین، بالواسطہ طور پر، اسلام ہی کی پیدا کردہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں اسلام کے پیرو ہی سب سے پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔

اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں دین حق کی تبلیغ و اشاعت کا بالکل نیا میدان کھول دیا ہے۔ آج سیاسی جبر اور ذہنی رکاوٹ دونوں سے آزاد ہو کر خداوندی پیغام کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ ہم خود اپنی نادانی کی وجہ سے دوبارہ کسی نئے عنوان سے وقت کے حکمرانوں سے وہی ٹکراؤ شروع کر دیں جس سے خدا نے دعوت اسلامی کی تحریک کو محفوظ کر دیا تھا۔

۳ ۔ سائنٹفک اسلوب بیان

اس سلسلے میں ایک بات دعوت حق کے اسلوب سے متعلق ہے۔ قرآن میں دعوت حق کو جس زبان میں پیش کیا گیا ہے، وہ فطرت کی سادہ زبان ہے۔ "افی اللہ شك فاطر السماوات والارض" کی زبان سے قدیم زمانہ کا تعلیم یافتہ انسان زیادہ مانوس نہ تھا۔ وہ یا تو جادو اور طلسمات سے متاثر ہوتا یا خیالی فلسفوں سے

یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم صوفیاء کو یوگ اور اشراق سے اس ذوق کے لئے تسکین فراہم کرنی پڑی اور متکلمین کو یونانی فلسفہ سے۔ قُصّاص کے گروہ نے اسی مقصد کے لئے بے شمار تعداد میں عجائب وغرائب قصے گھڑے اور ان کے ذریعہ اسلام کی ایک الف لیلہ تیار کر دی۔

مگر اب صورت حال مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ اب سائنس کے انقلاب کے بعد، وہی زبان اور اسلوب وقت کا معیاری اسلوب قرار پا گیا ہے جو چودہ سو برس پہلے قرآن میں اختیار کیا گیا تھا۔ یہ ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مدد ہے۔ اب ہمیں نہ تو بے معنی قسم کی روحانی ورزشوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہے اور نہ قصہ گوئی اور فلسفہ طرازی کا کمال دکھانے کی۔ اب قرآن کی دعوت کو اس کے سادہ فطری اسلوب ہی میں لوگوں کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ قرآن وحدیث کے سادہ ترجمے، سیرت رسول اور حالات صحابہ پر واقعاتی اسلوب میں لکھی ہوئی کتابیں اگر مختلف زبانوں میں مرتب کر کے دنیا بھر میں پھیلا دی جائیں تو یہی اقوام عالم پر حجت قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔

۹۔ وسائل کا خداداد خزانہ

آخری بات یہ کہ موجودہ زمانہ میں علم کی ترقی اور پریس کی ایجاد نے دعوتی کام کی انجام دہی کے لئے لامتناہی امکانات کھول دیئے ہیں۔ حضرت مسیح کی آواز، آنجناب کے زمانہ میں فلسطین کے ایک قصبہ سے باہر نہ جا سکی۔ مگر آج آپ کے پیرو بیک وقت دو ہزار سے بھی زیادہ زبانوں میں مسیحی مذہب کو منتقل کر رہے ہیں اور سارے عالم میں مسلسل اس کی آواز پہنچا رہے ہیں۔ کل اور آج کا یہ فرق دراصل زمانہ کا فرق ہے۔ آج ایسے وسیع الاثر مواقع کھل گئے ہیں کہ زمین کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر ساری دنیا میں دعوت کے کام کو منظم کیا جا سکتا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی دریافت نے دعوت کے عمل کو مقامی پیغام رسانی کے دور سے نکال کر عالمی پیغام رسانی کے دور میں پہنچا دیا ہے۔

جدید صنعتی دور میں مسلمان اپنی اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ دعوت حق کی اشاعت کے لئے جدید امکانات کو اعلیٰ سطح پر استعمال کر سکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں میں پٹرول کے خزانے برآمد کر کے ان کی اقتصادی پس ماندگی کی تلافی کر دی اور انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اس فریضہ کی ادائگی کی بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی اس کو انتہائی کامل شکل میں جاری رکھ سکیں۔

ہمارے رب نے ہمارے لئے سیاسی اور فکری رکاوٹیں بھی دور کر دی ہیں اور اقتصادی رکاوٹیں بھی۔ اس سہ طرفہ نصرت کے بعد بھی مسلمان اگر دعوتی کام کے لئے نہ اٹھیں تو انھیں اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے، خواہ دعوت کی ذمہ داری کو چھوڑ کر وہ کوئی دوسرا کام کتنی ہی بڑی مقدار میں کیوں نہ انجام دے رہے ہوں۔

خاتمہ کلام

قدیم زمانہ میں شرک (غیر اللہ کی فوق الفطری کبریائی) کا عقیدہ غالب عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا جس طرح آج، مثال کے طور پر، انسانی آزادی کے تصور نے ساری دنیا میں غالب عقیدہ کی حیثیت حاصل کر لی

ہے۔ اس صورت حال نے قدیم زمانہ میں بے شمار مصنوعی مسائل پیدا کر رکھے تھے جن میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ توحید کے داعیوں کو آگ اور خون کے طوفان سے گزر کر حق کا پیغام دینا پڑتا تھا۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا، اس نے شرک کو غالب عقیدہ کے مقام سے ہٹا دیا اس کے بعد ایک نیا تاریخی عمل شروع ہوا۔ آغاز اسلام کے تقریباً ہزار ویں سال اس انقلاب کے دو حصے ہو گئے۔ اس کا مذہبی پہلو اسلامی دنیا میں محفوظ رہا۔ اور اس کا دنیوی پہلو اس سے الگ ہو کر مغربی دنیا کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہاں اس نے مزید ترقی شروع کی۔ یہاں تک کہ ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے زمانے میں وہ اپنے آخری کمال تک پہنچ گیا۔ موجودہ زمانہ میں جمہوریت، آزادی رائے، سائنسی نقطۂ نظر، سب اسی کی مثالیں ہیں جو در حقیقت اسلامی انقلاب کے دنیوی پہلو یا اس کے سیکولر نتائج ہیں۔

اسلام کے زیر اثر پیدا شدہ اس انقلاب نے جدید دنیا میں اسلام کی توسیع و اشاعت کے نئے دروازے کھول دیئے تھے۔ ایک طرف یہ ممکن ہو گیا تھا کہ توحید کی پیغام رسانی کے کام کو نہایت قوت کے ساتھ بالکل آزادانہ ماحول میں شروع کیا جا سکے۔ دوسری طرف پریس اور جدید ذرائع ابلاغ نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا تھا کہ اسلامی دعوت کی مہم کو عالمی سطح پر منظم کیا جا سکے۔ مگر عین اس وقت ایک حادثہ پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں نے دعوت کے بجائے سیاست کا رخ اختیار کر لیا۔ وقت کے حکمرانوں سے ٹکرا کر انھوں نے اپنے لئے نئے عنوان سے وہی مشکلات پیدا کر لیں پیدا کر لیں جن کو اسلام کے ہزار سالہ عمل نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔

اسلام کی تاریخ میں کوئی واقعہ اتنا الم ناک نہیں جتنا الم ناک یہ واقعہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تقریباً تمام اسلامی تحریکوں نے سیاسی مقابلہ آرائی کو کام سمجھا اور غیر ضروری طور پر اسلام کو اقتدار کے مدمقابل کھڑا کر دیا۔ کسی تحریک نے شروع ہی سے میدان سیاست میں چھلانگ لگا دی۔ کوئی بعد کو اس "مقدس جہاد" کی طرف مڑ گئی ـــــــ ٹھیک اس وقت جب کہ تاریخ کا عمل اپنی آخری انتہا کو پہنچ کر ہمارے لئے دعوتی کام کا عالی شان میدان کھول رہا تھا، ہم انتہائی نادانی کے ساتھ ایک ایسی سیاسی لڑائی میں مشغول ہو گئے جس کا کوئی نتیجہ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں تھا، نہ دینی نہ دنیوی۔ اب اس غلطی کی واحد تلافی یہ ہے کہ سیاست بازی کو مکمل طور پر ترک کر کے قرآن و سنت کے پیغام کو اہل عالم تک پہنچانے کا کام فوراً شروع کر دیا جائے۔

اپریل ۱۹۷۷ میں جامعہ دار السلام عمر آباد کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس موقع پر ۷ اپریل کی نشست میں یہ مقالہ مختصاً بہ شکل تقریر پیش کیا گیا۔

"جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں سخت عذاب کی خوش خبری دے دو" (توبہ ۔ ۳۴) قرآن کی یہ آیت اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تبا للذھب تبا للفضۃ (برا ہو سونے کا اور برا ہو چاندی کا)۔ یہ بات جب آپ کے اصحاب کو معلوم ہوئی تو وہ تشویش میں پڑ گئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: فای مال نتخذ (اب ہم کون سا مال جمع کریں)۔ حضرت عمرؓ اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا، اگر تم لوگ پسند کرو تو میں اس کی بابت رسول اللہ ؐ سے سوال کروں۔ لوگوں نے کہا، ہاں۔ چنانچہ وہ آپ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے اصحاب کہہ رہے ہیں کہ کاش ہم جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اس کو جمع کرتے۔ آپ نے فرمایا:

لیتخذ احدکم لسانا ذاکرا وقلبا شاکرا وزوجۃ مومنۃ تعین احدکم علی ایمانہ	تم میں سے ہر ایک یہ کرے کہ یاد کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل اپنائے اور ایسی بیوی اختیار کرے جو اس کے ایمان میں اس کی مدد کرے۔
تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، صفحہ ۳۵۱	

خواتین اسلام

حضرت ام سلمہ ایک بار کسی عورت سے اپنے بال گندھوا رہی تھیں۔ اتنے میں مسجد سے خطبہ کی آواز آئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ایھا الناس (اے لوگو) یہ سنتے ہی فرمایا، بس جیسے ہیں ویسے ہی باندھ دو، عورت نے کہا اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو آپ نے ایھا الناس کہا ہے۔ انھوں نے کہا "خوب! کیا ہمارا شمار آدمیوں میں نہیں" یہ کہہ کر خود ہی بال باندھ کر کھڑی ہوگئیں اور قریب ہو کر خطبہ سننے لگیں۔ (طبقات ابن سعد) حضرت ام سلمہ کی مرویات کی تعداد ۳۷۸ ہے۔ وہ فتویٰ بھی دیا کرتی تھیں۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اگر ان کے فتوے جمع کئے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو جائے گا۔

رسول اللہ ؐ کی ازواج میں حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ ذہین تھیں۔ ان کی مرویات کی تعداد ۲۲۱۰ تک شمار کی گئی ہیں۔ ان سے تقریباً ایک سو صحابہ و تابعین نے روایت کیا ہے۔ عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب، عبداللہ بن عامر، مروق بن اجدع، عکرمہ اور علقمہ جیسے لوگ آپ کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ حضرت عائشہ ایک اعلیٰ درجہ کی فقیہ خاتون تھیں۔ جب کوئی حدیث بیان کرتیں تو اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دیتیں۔ حضرت ابو سعید اور حضرت عبداللہ بن عمر سے جمعہ کے غسل کے بارے میں صرف اس قدر مروی ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا چاہئے۔ مگر اسی حدیث کو حضرت عائشہ نے بیان کیا تو یہ بھی فرمایا کہ لوگ دور دور کی آبادیوں سے نماز جمعہ کے لئے مدینہ آتے تھے۔ وہ گرد و غبار سے اٹے ہوتے اور پسینہ سے تر ہوتے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ نہا لیا کرو۔

بنی غفار کی ایک عورت کہتی ہیں کہ میں اپنے قبیلہ کی کچھ عورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ آپ خیبر کے جہاد کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ ہم نے

عرض کیا: اے خدا کے رسول! ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں۔ تاکہ ہم زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔ اور جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی مدد کریں۔ آپؐ نے فرمایا: علی برکۃ اللہ (اللہ برکت دے، چلو)۔ انصاری خاتون ام عطیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزووں میں شرکت کی ہے۔ میں مجاہدوں کے کجاووں کی دیکھ بھال کے لئے پیچھے رہتی، ان کے لئے کھانا پکاتی، زخمیوں کا علاج کرتی اور مصیبت زدوں کی نگرانی کرتی۔ اسماء بنت یزید بن سکن حضرت معاذ بن جبل کے چچا کی بیٹی تھیں۔ ان کی بابت حضرت مہاجر بتاتے ہیں کہ انھوں نے جنگ یرموک میں خیمہ کی لکڑی سے نو رومیوں کو قتل کیا۔

مدینہ کے یہودیوں سے جنگ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ عورتوں اور بچوں کو ایک قلعہ کی چھت پر جمع کر کے حسان بن ثابت رضؓ کو ان کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رکھا گیا تھا۔ صفیہ بنت عبد المطلب بھی اسی قلعہ کی چھت پر تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ہمارے قریب سے ایک یہودی گزرا۔ اور ہمارے قلعہ کا چکر لگانے لگا۔ اس وقت بنی قریظہ نے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ اس وجہ سے ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راستہ کٹ گیا تھا۔ اور وہاں کوئی نہیں تھا جو یہود کے مقابلہ میں ہماری مدافعت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان دشمن کے مقابلہ میں تھے، وہ ان کو چھوڑ کر ہماری طرف نہیں آسکتے تھے۔ اتنے میں آنے والا یہودی سامنے سے گزرا۔ میں نے کہا اے حسان! دیکھو یہ یہودی ہمارے قلعہ کا چکر لگا رہا ہے اور میں خدا کی قسم اس سے مامون نہیں۔ کہیں وہ ہماری اس غیر محفوظ حالت کو یہودیوں سے جا کر کہہ نہ دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب جنگ میں مشغول ہیں۔ پس اترو اور اس کو جا کر قتل کر دو۔ حسان بن ثابت نے کہا: واللہ لقد عرفتِ ما انا بصاحب ھذا (خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ میں اس کام کا نہیں)، وہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے مجھ کو یہ جواب دیا اور میں نے ان کے پاس مارنے کی کوئی چیز بھی نہ دیکھی، تو میں نے کمر سے کپڑا کسا اور ایک لکڑی ہاتھ میں لی۔ پھر قلعہ سے اتر کر اس کے پاس پہنچی اور اس لکڑی سے اس کو مارنا شروع کیا، یہاں تک کہ میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ پھر جب میں اس سے فارغ ہو گئی تو میں قلعہ میں واپس آئی اور حسان بن ثابت سے کہا کہ قلعہ سے اتر کر جاؤ اور اس کا سامان لاؤ۔ میں صرف اس لئے اس کا سامان اتارنے سے رک گئی کہ وہ مرد تھا، حسان بن ثابتؓ نے کہا: اے عبد المطلب کی بیٹی! مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ۴، صفحہ ۱۰۸)

زندگی کیا ہے، موت کی طرف ایک سفر۔ موت اس لئے آتی ہے تاکہ دوسری دنیا میں آدمی کی وہ مستقل زندگی شروع ہو جو دنیا کے عمل کے مطابق اچھی یا بری اسے گزارنی ہے۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے اس انجام کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے، گویا اس کو کبھی اس انجام سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا۔ آہ وہ انسان، جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

وہ خدا کے سایہ میں چلنے لگتے ہیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حریفوں پر جو حیرت انگیز سیاسی کامیابی حاصل کی اور جس طرح اپنے لائے ہوئے دین کو ایک پورے جغرافیہ پر غالب کر دیا، وہ ساری انسانی تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے۔ ہمارے قدیم مورخین اور سیرت نگار جب آپ کے ان عظیم کارناموں پر پہنچتے ہیں تو یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ "آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور آپ خدا کی ہدایت کے مطابق سارے اقدامات کرتے رہتے تھے"۔ یہ انداز تعبیر اتنا عام ہے کہ روایت پرست مورخین تو درکنار ابوالحسن ماوردی، ابویعلی الفراء، ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن قتیبہ جیسے لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

سیرت کے اس انداز کو بظاہر آپ کی عظمت و تقدس کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ پیغمبر اسلام کی تصغیر ہے۔ یہ آپ کو گائیڈڈ میزائل کی سطح پر پہنچا دینا ہے۔ بلاشبہ آپ اللہ کے نبی تھے اور اللہ کی طرف سے آپ کو ہدایات پہنچتی رہتی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ آپ ایک اعلیٰ ترین انسان اور اعلیٰ ترین مومن بھی تھے۔ آپ عام انسانوں کے لئے ایک معیاری نمونہ تھے کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص جب اپنے آپ کو دین حق کے لئے وقف کرتا ہے اور خدا کی یاد اور اس کی محبت میں مشغول ہو جاتا ہے تو خدا سے اس کا لازوال تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ وہ حسن و کمال کے سرچشمہ سے اس طرح مربوط ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس سے اس کی سرگوشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ دائمی طور پر اس کے سایہ میں چلنے لگتا ہے۔

پیغمبر اسلام کا تعلق اپنے رب سے صرف جبریل کے ذریعے ہی نہ تھا۔ بلکہ براہ راست بھی تھا۔ اور یہ وہی تعلق تھا جو ہر ایک کے لئے اس کے حوصلہ کے بقدر کھلا ہوا ہے۔ یہ تعلق قائم ہوتا ہے — قرآن میں تدبر سے، نماز میں مشغول ہونے سے، کائنات میں غور و فکر سے، ہر آن اپنے رب کو یاد کرنے سے، صبر و شکر اور قناعت کی زندگی اختیار کرنے سے، دعا و استغفار میں میں اپنے آپ کو لگائے رہنے سے۔ اللہ کی یاد میں کھو جانے سے۔ بندۂ مومن جب اس طرح اپنے آپ کو خدا سے جوڑتا ہے تو اس کو حیرت انگیز طور پر ایک بے پناہ بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اشیاء کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ "خدا کی نظر سے دیکھے، خدا کے پاؤں سے چلے اور خدا کے ہاتھ سے پکڑے"

پیغمبر اسلام نے اپنے حریفوں سے جو سیاسی معاملات کئے، وہ اگر پیشگی طور پر موصول شدہ ہدایات کے تحت تھے تو ایسا کیوں ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر آپ کے کسی اقدام یا فیصلہ پر گرفت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کو ایسا نہ کر کے ایسا کرنا چاہئے تھا۔ —— یہ خود قرآن میں ایک واضح مثال ہے جس سے اصل معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

> عرب دنیا میں مغرب کا سیاسی کنٹرول تقریباً ۷۵ سال رہا۔ اس کا آغاز ۱۸۸۲ میں مصر پر برطانیہ کے قبضہ سے ہوا، اور ۱۹۵۰ میں اردن اور عراق سے برطانی قبضہ کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوا۔

تعریف سے خوش ہونا اور تنقید سے بھڑکنا، پستی کی علامتیں ہیں۔

فانی بدایونی (۱۸۷۹-۱۹۴۰) نے کہا ہے کہ دنیا کی رنگینیاں انتہائی بے حقیقت ہونے کے باوجود اپنے ظاہر میں اتنی پُرکشش ہیں کہ انسان ان کو حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص دھوکا دینے والے ان مناظر سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے:

فریب جلوہ اور کتنا مکمل! اے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

اس میں شک نہیں کہ دنیا کی رنگینیوں سے اپنے کو اوپر اٹھالینا سخت مشکل کام ہے۔ تاہم کم تعداد میں سہی، ایسے لوگ پھر بھی کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں۔ مگر اس کے بعد "اوپر اٹھنے" کی ایک اور سطح ہے اور اس کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو کامیاب افراد کی تعداد کم یابی سے گزر کر نایابی تک پہنچ جائے گی۔ یہ ہے اپنے آپ کو مقیّد فکر (CONDITIONED THINKING) سے باہر نکالنا۔ ہر آدمی جن حالات میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے، اس کے لحاظ سے ماحول اور روایات کا ایک ہالہ اس کے گرد قائم ہوجاتا ہے۔ اس کا ایک فکری مدار بن جاتا ہے جس میں وہ گھومتا رہتا ہے۔

اس غیر محسوس مدار سے باہر آکر سوچنا اور مکمل طور پر آزادانہ رائے قائم کرنا اس قدر دشوار ہے کہ وہ لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں جو آزادانہ فکر کے علم بردار بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خلائی راکٹ جب اپنی گردش کے دوران زمین کے مدار سے نکل کر دوسرے سیارہ کے مدار میں داخل ہوتا ہے تو خول کے نقطہ پر دھماکہ کے ساتھ زبردست آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی قانون شاید انسانی زندگی کے لئے بھی ہے۔ کوئی شخص اپنے مدار سے نکل کر آزاد شعوری مدار میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے اس فکری خول کو توڑنے کے لئے پوری طرح تیار ہوجائے جو روایات اور ماحول کے اثر سے محض اتفاقی طور پر اس کے گرد بن گیا ہے۔

کوئی شخص کب اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو روایتی مدار سے نکال کر آزاد مدار کی طرف لے جانے کا عمل شروع کرسکے، اس کا ایک ہی جواب ہے: جب وہ اپنے آپ کو ایسا بنانے میں کامیاب ہوجائے کہ نہ ذاتی تعریف سے اسے خوشی حاصل ہو اور نہ ذاتی تنقید اسے بری لگے۔ کوئی آدمی کس مقام پر ہے، اس کو جاننے کی یہ واحد یقینی پہچان ہے۔

اگر آدمی اپنی ذات کے مدار میں گھوم رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے نہیں بچاسکتا کہ ذاتی تعریف اس کو اچھی لگے اور ذاتی تنقید پر وہ بوکھلا اٹھے۔ مگر جو شخص اپنے ذاتی مدار سے بلند ہوجائے وہ کبھی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ اس کو تعریف اور تنقید دونوں ہی بے معنی معلوم ہوں گی۔ کیوں کہ وہ حقائق کو ایسی بلند سطح سے دیکھ رہا ہوگا جہاں روایات اور ماحول کے اثرات اس کے لئے ایک خارجی چیز بن جاتے ہیں۔ بعض اعتبار سے ان میں ملوث ہونے کے باوجود وہ ان کو اس طرح دیکھ سکتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے سے باہر کی ایک چیز کا دور سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

عرب اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کی تاریخ ہزاروں برس پہلے تک جاتی ہے

ہندوستان اور عرب، دنیا کے وہ ملک ہیں جو ایک حیثیت سے پڑوسی کہے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں کے بیچ صرف سمندر حائل ہے۔ یہ سمندر گویا ایک وسیع قدرتی سڑک ہے جو دونوں ملکوں کو باہم ملاتی ہے۔

دریا کے کنارے بسنے والے ملک فطرتاً تجارتی ہوتے ہیں۔ یہی پہلا رشتہ ہے جس نے ان دونوں قوموں کو باہم آشنا کیا۔ عرب تاجر ہزاروں برس سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کی پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی تمام تحریریں بلکہ تمام آرین تحریریں بائیں طرف سے لکھی جاتی ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ آریہ ورت کی ابتدائی تحریریں داہنے سے شروع ہوتی ہیں جو سامی تحریروں کی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ گنتی لکھنے کا طریقہ بھی شاید ابتدائی ہندوستانیوں نے عرب تاجروں سے سیکھا تھا۔ (۸)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سنسکرت کے مقالہ کے تحت یہ تحقیق پیش کی ہے کہ :

"ہندوستانی تحریر کے قدیم ترین نمونے وہ کتبات ہیں جو چٹانوں پر کندہ ہیں۔ یہ مذہبی کتبے ۲۵۳ ق م میں شہنشاہ اشوک نے کندہ کرائے تھے۔ یہ کتبات دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو داہنی جانب سے بائیں جانب پڑھے جاتے ہیں ان کو "آرین پالی" کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو بائیں جانب سے داہنی جانب پڑھے جاتے ہیں، ان کو ہندی پالی کہا جاتا ہے۔

پروفیسر بولر (BUHLER) نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ شاید عراق کے تاجروں نے آٹھویں صدی ق م میں ان حروف کو یہاں روشناس کرایا ہو۔"

ستیارتھ پرکاش کے مصنف سوامی دیانند جی کے بیان کو صحیح مانا جائے تو مہابھارت کے زمانے میں ہندوستان میں ایسے لوگ تھے جو عربی زبان سے واقف تھے۔ انھوں نے لکھا ہے :

"مہابھارت میں جب کوروؤں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوؤں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر جی نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا۔"

ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے"، چنانچہ شروع زمانہ ہی سے عرب کثرت سے ہندوستان آنا شروع ہو گئے تھے اور محمود کی آمد سے سینکڑوں برس پہلے جگہ جگہ ان کی نوآبادیاں قائم تھیں۔

عربوں کو اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے ہندوستان کے کسی ساحلی بندرگاہ کی تلاش تھی۔ چنانچہ اسلام کے ظہور کے بعد ہندوستان پر عربوں کی سب سے پہلی فوج کشی ۱۵ ھ (۶۳۶ء) میں تھانہ (بمبئی) کی بندرگاہ پر ہوئی۔ عربوں کا یہ داخلہ بحرین کے

گورنر کے حکم پر ہوا تھا۔

۸۶ھ (۷۰۵ء) میں دمشق کے تخت پر ولید اموی بیٹھا۔ اس کی طرف سے حجاج عراق وایران ومکران وبلوچستان یعنی حکومت کے مشرقی مقبوضات کا نائب مقرر ہوا تو ہندستان اور ہندستانی جزیروں کی طرف توجہ کی۔ اس وقت ہندستان کے اکثر ساحلوں سے بحری قزاق عرب تاجروں کے جہازوں پر ڈاکہ ڈالا کرتے تھے۔ البرونی (۴۲۴ھ) تک سومناتھ اور کچھ بحری ڈاکوؤں کی سب سے بڑی جائے پناہ تھی۔

حجاج کے زمانہ میں ایک بار سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب ڈاکوؤں نے عربوں کے ایک جہاز پر چھاپہ مارا جسمیں عورتیں بھی سوار تھیں۔ ان لوگوں نے حجاج سے فریاد کی۔ حجاج نے سندھ کے راجہ داہر کو لکھا تو اس نے معذرت کی کہ یہ دریائی ڈاکو ہمارے قبضہ میں نہیں۔ اسی دوران یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ مکران سے کچھ عرب مجرم اور باغی بھاگ کر سندھ میں پناہ گزین ہوئے اور انھوں نے راجہ داہر کی ماتحتی میں اپنا ایک جتھا بنالیا۔

اسکے بعد حجاج نے اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں شیراز سے چھ ہزار فوج سندھ روانہ کی اور کچھ فوج مع سامان کے دریائی راستے سے سندھ کی طرف بھیجی اور اس کی کمک کے لیے ایران کے پرانے راستہ سے خشکی کی طرف سے بھی فوجیں بھیجیں۔

سن ۹۳ھ میں محمد بن قاسم سندھ پہنچا اور تین برس کے عرصہ میں ملتان سے لے کر کچھ تک اور مالوہ کی سرحد تک پر قبضہ کرلیا اور پورے سندھ میں انصاف اور امن کی سلطنت قائم کردی۔

۹۶ھ میں ولید نے وفات پائی اور اس کی جگہ تخت پر سلیمان بیٹھا۔ اس کو حجاج اور اس کے خاندان سے ذاتی عداوت تھی۔ اس نے اسی سال حجاج کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ محمد بن قاسم کو بھی سندھ سے واپس بلالیا۔ اور بالآخر ذاتی انتقام کے نشے میں اس کو قتل کرادیا۔

اموی خلیفہ کے ہاتھوں یہ بیدردانہ قتل اس شخص کا تھا جس کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ "جب محمد بن قاسم سندھ سے واپس جانے لگا تو سندھ کی رعایا نے اپنے نیک دل اور انصاف پسند فاتح کی جدائی میں آنسو بہائے اور اس کی یادگار میں اس کا بت بناکر کھڑا کیا"۔ (تاریخ فتوح البلدان بلاذری، باب فتح سندھ)

اس کے بعد خلافت دمشق سے مختلف گورنر یہاں مقرر ہوکر آتے رہے اور انھوں نے کچھ کارگزاریاں بھی دکھائیں۔ ۱۳۳ھ (۷۵۱ء) میں عربی حکومت کے دفتر کا ورق الٹ گیا۔ امویوں کی جگہ عباسی آئے اور حکومت کا مرکز دمشق سے ہٹ کر بغداد چلا گیا۔ بغداد کی سلطنت معتصم باللہ عباسی (م ۲۲۷ھ) تک مضبوط رہی۔ اس کے بعد وہ روز بروز ایسی کمزور ہوتی گئی کہ اس کا تعلق سندھ اور ہندستان سے ٹوٹ گیا۔ کچھ دن تک عرب امراء یہاں خودمختار بنے رہے۔ بالآخر ہندو راجاؤں نے پھر قبضہ کرلیا۔ اور بعد کو صرف دو مشہور عرب ریاستیں یہاں قائم رہ گئیں جن میں ایک ملتان میں تھی اور دوسری سندھ کے عربی شہر منصورہ میں۔

ہندوستان میں جو ترک وافغان مغل فاتح آئے وہ مسلمان تھے، اس لیے ان کی تمام کارروائیوں کا ذمہ دار اسلام سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس حقیقت سے ہم سب کو

واقف ہونا چاہیئے تھا کہ ترک فاتح جو ہندستان آئے۔ خاص خاص افسروں یا عہدیداروں کو چھوڑ کر قوم کی مجموعی حیثیت سے وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے۔ اور نہ ان کے اصول سلطنت کو اسلام کی طرز حکومت اور اصول فرمانروائی سے کوئی مناسبت تھی۔ ان کے ترک افسر زیادہ تر نومسلم غلام تھے جن کو اسلام کے صلح و جنگ کے قوانین سے شاید واقفیت بھی نہ تھی۔

غزنویہ سلطنت جس ملک میں آکر قائم ہوئی، وہ اسلامی حدود سلطنت کا سب سے آخری گوشہ تھا۔ وہاں اسلام نے ابھی پورا قدم بھی نہیں جمایا تھا۔ سلطان محمود کی فوج میں جو سپاہی بھرتی ہو کر آئے، وہ غزنی، خلجی، ترکوں اور افغانوں کے مختلف قبائل تھے۔ ہندو بھی اس کی فوج میں داخل تھے۔ ترک قبائل کا یہ حال تھا کہ وہ بیشتر مسلمان نہ تھے۔ وہ غلاموں کی حیثیت سے ہزارہا کی تعداد میں فروخت ہوتے تھے اور سلاطین و امراء ان کو خرید کر اور مسلمان بنا کر فوج میں بھرتی کرتے تھے، یا وہ خود لوٹ مار کے شوق میں وسط ایشیا سے نکل کر اسلامی ممالک میں آتے تھے اور مسلمان ہو کر مختلف بادشاہوں اور امیروں کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اور آگے چل کر بڑے افسر ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ بادشاہ بن جاتے تھے ــــ الپتگین اور سبکتگین جو غزنوی سلطنت کے بانی تھے اسی قسم کے ترک غلام تھے۔ سلطان غوری کے جانشین التمش وغیرہ بھی ایسے ہی تھے۔ سلجوقی ترک جو چند برس کے بعد عظیم الشان سلجوقی سلطنت کے بانی ہوئے، اسی زمانے میں اسلامی حد میں آکر مسلمان ہوئے۔ یہی حال سلطان محمود کی فوج کا بھی تھا۔ ترکستان اور ماوراءالنہر کے ترک رضاکار اس کی فوج میں داخل ہو گئے تھے جو زیادہ تر اسی زمانے میں مسلمان ہوئے تھے۔ ۱۸۸

مغل ابھی تک مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ ساتویں صدی ہجری تک کافر سمجھے جاتے تھے۔ علاؤالدین خلجی (م ۷۱۶ھ) تک فوج میں مغل مسلمان کر کے نوکر رکھے جاتے تھے۔

افغانوں کے بڑے بڑے شہروں میں گو اسلام تھا مگر خود افغان اب تک مسلمان نہ تھے۔ کافر ہی سمجھے جاتے تھے۔ گو خاص کابل کے بادشاہ نے تیسری صدی کے شروع میں، یعنی غزنویوں سے سو برس پہلے اسلام کا اظہار کیا تھا، لیکن افغانوں کے اکثر قبائل محمود غزنوی ہی کے زمانے میں مسلمان ہونے شروع ہوئے تھے۔

ان کے علاوہ غوری قبائل چوتھی صدی کے وسط تک یعنی غزنویوں کی پیدائش کے بعد تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ پھر سلطان محمود سے پہلے اس وقت تک ان اطراف میں نہ اسلامی درسگاہیں تھیں نہ اسلامی تعلیمات کا رواج ہوا تھا اور نہ مسلمان علماء پھیلے تھے۔ ان اسباب سے ان قوموں کے اس وقت کے طور طریق، اصول جنگ اور طرز عمل کو اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۹۰

برخلاف اس کے عرب فاتح جو ایک صدی کے اندر ایک طرف شام کی سرحد عبور کر کے مصر اور شمالی افریقہ کے راستے سے اسپین تک پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف عراق کے راستے سے خراسان تک اور ایران و ترکستان کو طے کر کے ایک سمت میں کاشغر اور دوسری سمت میں سندھ تک فتح کر چکے تھے۔ وہ لوگ تھے جن میں اسلام کی تعلیمات زندہ تھیں، اسلام کا قانون جنگ عمل میں تھا۔ کہیں کہیں افسروں میں بعض ایسے بزرگوار بھی تھے جنھوں نے پیغمبر اسلام کی صحبت اٹھائی تھی۔ اور ایسے تو

بکثرت تھے جنھوں نے صحابہ کا فیض پایا تھا۔ اس لئے ان کے طور طریق، اصول حکومت اور طرز سلطنت خیبر سے آنے والی قوموں سے بالکل مختلف تھے۔ ۱۹۰

پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے خاتمہ پر سندھ کی فتح کے چند سال بعد جب بنوامیہ کے دیندار اور برگزیدہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے سندھ کے لوگوں کو اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تو بہت سے راجاؤں نے اسلام قبول کرلیا۔ (فتوح البلدان بلاذری، فتح سندھ) ۲۲۸

مختلف تجارتی، معاشرتی اور سیاسی تعلقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ سندھ، گجرات، کارومنڈل، بلہار، مالدیپ، سراندیپ اور جاوا میں اسلام نے اپنے قدم آہستہ آہستہ بڑھانے شروع کئے۔ ان جزیروں میں ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف چینیوں کے اثر سے بدھ مت پھیلا ہوا تھا۔ مگر صدی بصدی کے جغرافیوں اور سفرناموں کی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کے بغیر پورے امن چین کے ساتھ اسلام کے اثرات یہاں بڑھتے جاتے ہیں۔

سندھ کا علاقہ خلیفہ المامون (۲۱۸ھ) تک بغداد کے مرکز سے وابستہ رہا، بلکہ اسی کے آخر زمانہ میں عرب امراء، خودمختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ چنانچہ بنی سامہ کے غلام فضل بن ماہان نے سندان نام کے ایک شہر کو فتح کرکے براہِ راست خلیفہ المامون سے اپنی امارت کی سند حاصل کرلی اور وہاں ایک جامع مسجد بنوائی جس میں نماز جمعہ ادا ہوتی تھی اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

اس کے بعد اس کا بھائی محمد بن فضل بن ماہان حاکم ہوا اور یہ زمانہ معتصم باللہ (۲۲۷ھ) کا تھا۔ اس نے ستر جہازوں کے بیڑے کے ساتھ سیدیون پر حملہ کیا۔ اس کی غیر حاضری میں اس کے بھائی ماہان نے ریاست پر قبضہ کرلیا اور غالباً اسی خانہ جنگی میں ریاست مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ (بلاذری، صفحہ ۴۴۶)

معتصم باللہ کے زمانہ میں قندابیل میں محمد بن خلیل نے خودمختاری کا اعلان کردیا تھا۔ مگر معتصم کے عہدہ دار، عمران برمکی والیٔ سندھ نے وہاں کے سرداروں کو گرفتار کرکے قصدار (قزدار) بھیج دیا۔

عمران برمکی ہی کے زمانہ میں عربوں کے دو مشہور قبیلوں یمنی (قحطانی) اور حجازی (نزاری) میں بعینہ وہی خانہ جنگی شروع ہوئی جس خانہ جنگی نے بنوامیہ کا خاتمہ کردیا تھا۔ عمران نے یمنیوں کی طرف داری کی۔ اس وقت حجازیوں کا ایک سرگروہ ایک قریشی سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری تھا۔ اس نے موقع پاکر عمران کو قتل کردیا (بلاذری، ۴۴۶)

عمر بن عبدالعزیز ہباری کی امارت کے بعد بھی عباسی تعلق قائم رہا۔ چنانچہ معتمد کے زمانہ (۲۷۹-۲۵۶ھ) میں بغداد کے انتظامات ملکی میں سندھ کا نام بھی نظر آتا ہے۔ اس کے بعد سندھ کا یہ برائے نام رشتہ بھی بغداد سے کٹ گیا۔ بلاذری جو ۲۷۹ھ میں مرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "بنوکندہ کا آزاد کردہ غلام ابوالصمہ جو تیسری صدی کے شروع کے ایک عباسی والی عمر بن حفص بن ہزار مرد کے ساتھ سندھ گیا تھا۔ اس کا بیٹا صمد آج کل سندھ میں زبردستی خودمختار بن بیٹھا ہے۔" (بلاذری، ۴۴۵)

تاہم مسعودی ۳۰۳ھ میں ہندستان آیا تو اس نے دیکھا کہ یہاں عرب امراء حکمراں ہیں جو اب بھی خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھتے ہیں۔ ابن موقل ۳۶۷ھ میں اور مقدسی ۳۷۵ھ میں یہاں آیا تو انھوں نے بھی یہی پایا کہ خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ ■

زبان کا مسئلہ

ایک ہندوستانی عالم ایک عرب ملک گئے۔ وہاں ایک عرب نوجوان ان سے ملنے کے لئے آیا۔ گفتگو کے دوران اس نے پوچھا: متی القدوم (کب تشریف لائے) ہندستانی عالم نے جواب دینا چاہا تو ان کی زبان سے نکل گیا: غداً۔ عربی میں آئندہ کل کے لئے "غد" اور پچھلے کل کے لئے "امس"، کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مذکورہ بزرگ عربی کے اچھے عالم ہیں۔ مگر عربی بولنے کی مشق نہ ہونے کی وجہ سے وہ غداً (اگلے دن) کہہ گئے۔ حالاں کہ موقع کے اعتبار سے انھیں بالامس (پچھلے دن) کہنا چاہئے تھا۔

اسی طرح ایک اور ہندستانی عالم نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان انھوں نے قائم کیا: الاقدار الاسلامیۃ۔ یہاں اقدار کو انھوں نے انگریزی لفظ "ویلوز" کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ حالانکہ یہ اس لفظ کا اردو استعمال ہے۔ عربی میں ویلوز کے لئے قیمۃ (جمع قیم) بولا جاتا ہے۔

یہ اتفاقی غلطی کی مثال ہے جس سے کوشش کر کے آدمی بچ سکتا ہے۔ تاہم ایک غیر اہل زبان لغت اور نحو کی خواہ کتنی ہی مہارت حاصل کر لے، وہ اہل زبان کی سی زبان لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ الاماشاء اللہ۔ مولانا شبلی نعمانی عربی زبان کے ادیب تھے۔ وہ مصر و شام کے سفر پر گئے۔ وہاں ایک بار وہ اپنے ساربان سے عربی میں گفتگو کر رہے تھے۔ درمیان میں اس نے کہا:

یا شبلی انت نحوی (اے شبلی آپ تو قواعد داں ہیں)۔ مولانا شبلی سمجھے کہ ساربان ان کی عربی دانی کی تعریف کر رہا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ طنز تھا۔ مولانا شبلی نحو و صرف کے قواعد کی انتہائی پابندی کرتے ہوئے بول رہے تھے۔ مگر عرب ساربان کو ان کی یہ زبان مصنوعی معلوم ہو رہی تھی۔

ہر زبان کے کچھ اپنے لطیف آداب ہوتے ہیں۔ اہل زبان چوں کہ بچپن سے اسی کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں، اس لئے وہ ذوقی طور پر اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ان کے لکھنے اور بولنے میں خود بخود ان آداب کی رعایت شامل ہوتی رہتی ہے۔ مگر غیر اہل زبان عام طور پر اس کی رعایت نہیں کر پاتے۔ مخزومی پاشا سید جمال الدین افغانی کے ایک رفیق ہیں۔ انھوں نے موصوف کے بارہ میں عربی میں ایک کتاب لکھی اور اس کا نام رکھا:

جمال الدین افغانی فی البلاط السلطانی (جمال الدین افغانی شاہی مجلس میں) سید جمال الدین افغانی نے سنا تو کہا:

ان ھذا العنوان لیس لھذا المقال بطبیق، قل خاطرات ولا تزد

یہ نام اس کتاب کے موافق نہیں۔ اس کا نام صرف "خاطرات"، رکھو اور اس پر کچھ اضافہ مت کرو۔

مخزومی پاشا لکھتے ہیں کہ بعد کو میں نے ایک عرب ادیب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا، اگر کتاب کا یہ نام رکھا گیا تو اہل لغت اس پر تنقید کریں گے۔ کیوں کہ آپ "خاطرات جمال الدین" کا لفظ "افکار جمال الدین" کے معنی میں لے رہے ہیں۔ مگر اہل زبان اس مفہوم کے لئے "خواطر"، کا لفظ بولتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے اگرچہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں، مگر استعمال کے اعتبار سے خاطرات میں وساوس کا مفہوم آجاتا ہے۔ جمال الدین افغانی نے اپنی آزاد طبعی کی بنا پر اس کو تسلیم نہیں کیا اور مخزومی پاشا سے کہا قل خاطرات ولا تبال بمن فسد لسانھم (تم کتاب کا نام خاطرات ہی رکھو اور ان کی پروا

مت کرو جنھوں نے اپنی زبان کو بگاڑ رکھا ہے۔

اہل زبان اور غیر اہل زبان کا یہ فرق اتنا حتمی ہے کہ تاریخ میں بمشکل ہی کچھ مثالیں اس کے خلاف تلاش کی جا سکتی ہیں۔ مرزا غالب (۱۷۹۷–۱۸۶۹) کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ انھوں نے اپنے فارسی دیوان کے بارے میں کہا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

مگر غالب کو شاعری کی دنیا میں جو مقام ملا وہ ان کے اردو کلام کی بنا پر ملا، فارسی کے کلام کی بنا پر نہیں ملا۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷–۱۹۱۴) نے جب پہلی بار اردو میں سیرۃ النعمان لکھی تو اس کے آغاز میں ایک فارسی معذرت شامل کی، جس میں انھوں نے کہا:

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود
حرف بہ اردو زدن آئیں نبود

مگر شبلی کو اُن کی جن کتابوں نے شبلی بنایا وہ اردو کتابیں ہی تھیں نہ کہ فارسی اور عربی کتابیں۔ اسی طرح مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳–۱۹۳۰) نے تفسیر قرآن کو اپنا موضوع بنایا اور اس پر بہت سی قیمتی تحریریں لکھیں یہ تمام تحریریں عربی زبان میں تھیں۔ مگر ان کی عربی تحریریں نہ ہندستان میں مقبول ہو سکیں اور نہ عالم عرب میں۔ جب ان کا ترجمہ اردو میں شائع کیا گیا، اس وقت لوگوں کو ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔

یہ بات اردو یا عربی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر زبان کا یہی حال ہے۔ ہندستان میں انگریزی کے رواج کے بعد بے شمار لوگوں نے انگریزی کو اپنی قلمی زبان بنایا۔ مگر بمشکل ہی کچھ ایسے لوگوں کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے انگریزی ادب کی تاریخ میں کوئی مقام حاصل کیا ہو۔ جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی وغیرہ کی انگریزی تحریریں بلاشبہ یورپ اور امریکہ میں کافی پڑھی گئیں۔ مگر ان کو جو کچھ بھی مقبولیت حاصل ہوئی، ان کی تاریخی اہمیت کی بنا پر ہوئی، کیونکہ ہندستان کی جدید سیاسی تاریخ جاننے کے لیے یہ کتابیں ماخذ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سی۔ نراد چودھری جو انگریزی اور بنگالی دونوں کے اچھے ادیب ہیں، انھوں نے ٹیگور کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۹۱۳ میں نوبل انعام ملنا ان کے لئے ایک حادثہ تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد ٹیگور نے سمجھ لیا کہ ایشیا سے زیادہ یورپ ان کے فن کا قدردان ہے۔ انھوں نے انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا۔ مگر انگریزی ان کے لئے بہر حال ایک غیر ملکی زبان تھی۔ اس میں وہ دیسی گہرائی اور کشش پیدا نہ کر سکے جو اپنی مادری زبان بنگالی میں لکھنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔
کہا جاتا ہے کہ اربندو گھوش نے بعد کی عمر میں بنگلہ زبان سیکھی تو اس کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ گیتان جلی کو اصل بنگالی زبان میں پڑھ سکیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ کوئی ادیب یا مصنف خواہ کتنی ہی زبانیں جانتا ہو مگر اپنی مادری زبان میں وہ جس لطافت اور حسن کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے، کسی دوسری زبان میں اس کی امید نہیں کی جا سکتی۔ بعض شاذ مثالیں ہو سکتی ہیں۔ مگر الشاذ کالمعدوم۔

ناکامی کی وجہ

شریف کامل ایک اخوانی رہنما ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاست میں قبل از وقت داخل ہو گئی: تدخلنا فی السیاسة قبل وقتها

رکوع وسجود کا منظر اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ کوئی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

عیسائیت کو میں نے چھوڑا ہے اور اسلام کو اختیار کیا ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ مسیحیت میں بھی حق وصداقت اور مفید اصول موجود ہیں اور اگر اس مذہب سے وہ تمام بدعتیں دور کر دی جائیں جو پادریوں نے پیدا کر دی ہیں تو یہ مذہب بھی انسان کے لیے ایک مفید مذہب بن سکتا ہے۔ لیکن ان بدعتوں نے اس کی اصل صورت کو بگاڑ دیا ہے اور بالکل بے جان کر ڈالا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام اسی ابتدائی شکل میں ہے جس میں وہ جلوہ گر ہوا تھا اور چونکہ میں ایک ایسے مذہب کا متلاشی تھا جو آمیزش سے پاک ہو اس لیے میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ کسی عیسائی کلیسا میں چلے جائیے وہاں نقش ونگار اور مورتیوں کے سوا آپ کو کچھ نہیں ملے گا اس کے علاوہ پادریوں کے زرق برق لباس پر نظر ڈالیے اور پھر ان کے طریقوں راہبوں اور ننوں کے ہجوم کو دیکھیے تو ان کا روحانیت سے دور کا بھی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی عبادت گاہ میں نہیں ہیں بلکہ ایسے بتخانہ میں ہیں جو صرف بتوں کی پوجا کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد مسجد پر نظر ڈالیے وہاں آپ کو نہ کوئی مورت دکھائی دے گی اور نہ تصویر۔ پھر نمازیوں کی صفوں پر نظر ڈالیے ہزاروں چھوٹے بڑے انسان شانہ ملائے کھڑے نظر آئیں گے۔ امام کو دیکھیے تو اس کا لباس بھی نہایت سادہ ہوگا سچ تو یہ ہے کہ نماز میں رکوع وسجود کا منظر اس قدر جاذب قلب ہوتا ہے کہ کوئی انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسجد کی پوری فضا اور اس کی تمام چیزیں روحانیت کی جانب انسان کی رہنمائی کرتی ہیں نہ یہاں تصنع ہے نہ بناوٹ کی قسم کی کوئی چیز۔ اس کے برخلاف کلیسا کی تمام چیزوں میں مادی دنیا کا مظاہرہ بہت زیادہ ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ پروٹسٹنٹ مذہب تو ان عیوب سے پاک ہے اس نے تو ان گرجوں سے بت اور تصویریں نکال پھینکی ہیں تم نے اسلام کے بجائے اسے قبول کیوں نہیں کیا۔ بلاشبہ پروٹسٹنٹ مذہب حقیقی مسیحیت سے قریب ضرور ہے۔ باوجود اس اعتراف کے کہ مسیح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر تھے، میں ہرگز ان کی الوہیت کا قائل نہیں جو میری ہی طرح گوشت پوست رکھتے تھے میرا یہ عقیدہ کوئی نیا نہیں، بلکہ ابتدا ہی سے میں اسکا اظہار کرتا رہا ہوں۔ اسلام نہ صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہی کا پورا احترام سکھاتا ہے بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور بانیان مذاہب کے احترام کی دعوت دیتا ہے۔ میں عرصہ دراز سے اسلام کی طرف رجوع تھا لیکن میرا ایمان اتنا قوی نہیں تھا کہ میں بے دھڑک اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر سکتا۔

یہ تذبذب کسی انسان یا سوسائٹی کے خوف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پوری طرح اسلام کی خوبیوں اور خصوصیتوں سے واقف نہیں تھا۔ میں اسلام کے بارے میں علمائے اسلام کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا اور میری آنکھیں کھلتی گئیں اور مجھے صاف طور پر اس دین متین کی خوبیاں اور اس کے پیغمبر محمدؐ کا بنی نوع انسان پر احسان معلوم ہوگیا اور آخر میں نے اس

امریکی نومسلم پروفیسر اے. ایچ. بی. ہیوٹ نے قبول اسلام کے بعد اپنے جو تاثرات شائع کئے ہیں، ان کو یہاں نقل کیا جارہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے مطالعہ کے بعد میں نے اس دین کو اپنے دل کی آواز پایا اور اس دین فطرت کو قبول کرلیا۔ یہی واقعہ دوسرے بیشمار لوگوں کے ساتھ ہوسکتا ہے، بشرطیکہ ان کو اسلام کے پیغام سے واقف کرایا جائے۔

دین فطرت کو اپنا مذہب بنالیا۔ اسلام میں توحید پرستی جیسی میں نے پائی ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں ہے اور اسلام کی اسی توحید پرستی نے مجھے سب سے پہلے اس مذہب کی جانب مائل کیا۔ اسلام میں جو سب سے بڑی خوبی میں نے پائی ہے وہ یہ ہے کہ وہ صرف روحانی ترقی ہی کا حامل نہیں ہے بلکہ وہ دنیاوی ترقی میں بھی بہت بڑا ممد و معاون ہے وہ انسان کو گوشہ نشینی اور راہبانہ زندگی گزارنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ کارگہ حیات میں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ دینی معاملات میں ہی انسان کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر معاملہ میں انسان کو راستہ بتاتا ہے اور قدم قدم پر بنی نوع انسان کو روشنی دکھاتا ہے اسلام نے دنیا کو عاقبت کی کھیتی قرار دیا ہے اور اسے حق دیا ہے کہ وہ دینی فرائض سے بھی غافل نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کا شدید مخالف ہے۔ وہ صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کے ساتھ مروت یا محبت کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ وہ کل بنی نوع انسان کے ساتھ خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہیں ہمدردی ومساوات کا حکم دیتا ہے وہ تفریق کا نہیں اتحاد انسانی کا قائل ہے سچ تو یہ ہے کہ اس مذہب نے پہلی مرتبہ انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا۔

میں گزشتہ پانچ سال سے مذہب اسلام کا پیرو ہوں جس چیز نے میرے ایمان کو تقویت دی وہ اسلام کے بلند اور پاک اصول ہیں اس کی عالمگیر اخوت ہے۔ اس کی بے نظیر مساوات ہے اور اس کا علم وعرفان ہے جس نے میرے دل و دماغ میں ایک نئی روشنی پیدا کردی ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو سراپا علم وعمل ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اسلام ایک ایجابی دین ہے کوئی اگر صحیح معنوں میں عیسائی بننا چاہے تو اسے دنیا سے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرنی ہوگی لیکن اسلام میں رہ کر دنیا کی تمام مسرتوں اور نعمتوں سے مستفیض ہوسکتے ہیں۔ نہ ہمیں عبادت کا گوشہ تلاش کرنا ہوگا اور نہ ہی ویرانوں میں زندگی بسر کرنے کی مجبوری ہوگی۔ اگر انسان کو دنیا میں اسی لیئے بھیجا گیا ہے کہ وہ گوشہ نشینی میں اپنی زندگی برباد کرلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے یہ صرف اسلام نے بتایا ہے کہ انسان اس کارگاہ حیات میں رہ کر قدرت کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائیگی مگر ساتھ ہی اپنے پروردگار اور اس کی مخلوق کو نہ بھولے۔ میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے میں انتہائی قلبی سکون محسوس کررہا ہوں۔ میری دنیا بھی درست ہوگئی ہے اور عاقبت بھی۔

تہذیب کا ارتقائی عمل انسانی شعور کو ایک اعلیٰ مرحلہ کی طرف لے جارہا ہے

مشینی ترقیاں ان کو مطمئن نہ کرسکیں

۱۸۴۰ء میں ہر امریکی کی جیب میں مستقبل کا ایک خوب صورت خاکہ موجود ہوتا تھا بالکل ویسے ہی جیسے ہر جیب میں رومال موجود ہوتا ہے۔ مگر آج امریکیوں کی جیبیں اس قسم کی کسی پرشوق چیز سے خالی ہیں۔ لوگ سماجی حالات سے سخت مایوس ہیں۔ اعلیٰ سماج بنانے کے تصورات ختم ہوگئے ہیں۔ زمین پر بہشت بنانے کا خیال اب اپنی ذات کے اندر بہشت ڈھونڈنے کی طرف مائل ہے۔ آج کی برباد دنیا میں مفکرین کی ایک بڑی تعداد نے آئیڈیلزم کی آخری پناہ گاہ کے طور پر اپنی امیدوں اور اپنے عقیدہ کو روح کے اوپر مرکوز کردیا ہے۔ مادیات کے بجائے روحانیات کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے بعض لوگوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ ارتقائی عمل تہذیب کو شعور کے ایک اعلیٰ مرحلہ کی طرف لے جارہا ہے جو

جب قدرتی توازن ٹوٹ جائے

طبیعیات اور حیاتیات کی دنیا میں جو قوانین کام کر رہے ہیں۔ ان کا ایک خاص عمل یہ ہے کہ یہ قوانین مختلف اشیاء کے درمیان ایک فطری توازن (NATURAL BALANCE) کو برقرار رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسانی زندگی تباہ ہوجائے۔ جدید دریافتوں سے معلوم ہوا ہے کہ فطرت کا یہ توازن انتہائی صحیح اندازوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ اسکے اندر انسان کی کوئی مداخلت شدید خطرہ پیدا کرنیکا باعث ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر جدید تمدن کا وہ خطرناک مسئلہ جس کو صنعتی کثافت (INDUSTRIAL POLLUTION) کہتے ہیں، وہ کیا چیز ہے۔ وہ قدرت کے نظام میں انسانی مداخلت سے پیدا شدہ ایک صورتحال ہے۔ کاربن گیس اور دوسری کثافتیں جو عام حالات میں پیدا ہوتی ہیں، قدرت ان کے اعادہ دوری (RECYCLE) کے ذریعہ اپنے توازن کو برقرار رکھتی ہے۔ مگر صنعتی دور نے اپنی پیدا کردہ کثافتوں سے اس نظام میں جو مداخلت کی، اس نے فطرت کے توازن کو بگاڑ دیا۔

توازن فطرت کے ٹوٹنے کا یہی معاملہ سماجی قوانین میں بھی کام کرتا ہے۔ خدا نے جسطرح طبیعی اور حیاتیاتی دنیا میں توازن کا قانون جاری کر رکھا ہے، اسی طرح اس نے سماجی زندگی میں توازن کو برقرار رکھنے کیلئے بھی قوانین مقرر کئے ہیں۔ انھیں قوانین کا نام آسمانی شریعت ہے۔ انسان کی بہتری یہ ہے کہ وہ اس قانون کو استعمال کرکے سماجی زندگی کے توازن کو برقرار رکھے۔ اگر انکو نظرانداز کرکے بطور خود قانون وضع کریگا تو وہ سماجی زندگی کے مطلوبہ توازن کو توڑ دے گا اور زندگی تباہ ہوجائے گی۔

بالآخر انسان کو بلند ترین حقیقت سے ملا دے گا یعنی خدا سے۔

صنعتی دور کی ترقی کے بعد امریکیوں نے سمجھا تھا کہ وہ ٹکنالوجی میں نجات حاصل کرلیں گے۔ مصنفین نے بڑے شاندار قسم کے خاکے پیش کئے۔ مگر ٹکنالوجی انسانی مسرت کے حصول میں ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے ذرائع نہایت آسانی سے انسانی ترقی کے بجائے انسانی بربادی میں استعمال ہونے لگے۔

ٹائم (نیویارک) ۱۸ جنوری ۱۹۷۱ء

اوپر جو عبارت نقل کی گئی، وہ امریکی میگزین کے ایک خصوصی مضمون کا ترجمہ ہے جس کا عنوان ہے۔

A VOYAGE TO UTOPIA

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مادی ترقیوں کی حقیقت کیا ہے۔ آج کی دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک مادی ترقی کی تمام قسموں کا مالک بننے کے بعد بالآخر جس احساس سے دوچار ہے وہ یہ کہ مادی ترقی انسانی ترقی کا اصل زینہ نہیں۔ حقیقی انسانی ترقی کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔

امریکہ اس دوسری چیز کو نفسیات اور روحانیات کی دنیا میں تلاش کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس دنیا میں جس کی نشاندہی مذہب نے کی تھی مگر مادیات کے ابتدائی جنون میں لوگوں نے اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔

یہ بہترین وقت ہے کہ حاملین اسلام اٹھیں اور جدید دنیا کے سامنے خدا کے دین کی دعوت پہنچائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ نے صدیوں کے انقلابات کے بعد دین خدا کی حامل قوموں کے لیے میدان خالی کر دیا ہے۔ وہ آج کی دنیا کی ذہنی قیادت حاصل کر سکتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اس سنہرے امکان کے عین کنارے وہ اس طرح غافل پڑی ہوئی ہیں۔ جیسے انھیں اس کی خبر بھی نہیں۔

کیسے کیسے مسائل!

مسجد میں کسی کو چھینک آجائے تو دوسرا شخص جو حالت نماز میں ہے، اگر اس کی زبان سے یرحمک اللہ (خدا تجھ پر رحم کرے) نکل جائے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ البتہ اگر وہ یرحمہ اللہ (خدا اس پر رحم کرے) کہے تو نماز باطل نہ ہوگی۔ یہ شافعیہ کا مسلک ہے۔

حنفیہ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ مسجد میں کسی کو چھینک آئے تو مصلی خواہ یرحمک اللہ کہے یا یرحمہ اللہ، ہر حال میں اس کی نماز باطل ہوجائے گی البتہ اگر خود مصلی کو چھینک آئے اور وہ اپنے کو مخاطب کرتے ہوئے یرحمنی اللہ (مجھ پر اللہ رحم کرے) یا یرحمک اللہ کہے تو نماز باطل نہ ہوگی۔

الفقہ علی المذاھب الاربعہ
از عبدالرحمٰن الجزیری،
حصہ اول، صفحہ ۳۰۴

مؤلفہ :

مولانا وحیدالدین خاں

صفحات ۲۴۲ــ قیمت مجلد مع پلاسٹک کور پندرہ روپے

قیمت مجلد بغیر پلاسٹک کور تیرہ روپے

دین کی حقیقت، تعلیمات قرآن کی حکمتیں، سیرت رسول کا انقلابی سبق
موودہ زمانہ میں اسلام کے مسائل، دین کا تجدید و احیاء
امت مسلمہ کی تعمیر، دعوت اسلامی کے جدید امکانات ــ

ان موضوعات کے گہرے مطالعہ کے لئے "الاسلام" پڑھئے۔
جدید سائنٹفک اسلوب میں، نہایت دلچسپ اور معلومات سے بھرپور۔

اسلام کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

پندرہ روپئے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر طلب فرمائیں
کتاب کی روانگی کا ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔
بیرونی ممالک کے لئے تیس روپے یا اس کے مساوی رقم

الدار العلمیہ، جمعیتہ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶

AL-DARUL ILMIYYA, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)

"فرانسیسی مفکر اینڈری مالرو نے کہا ہے کہ یورپ کا عروج ۱۴۵۰ء میں شروع ہوا۔ یہ دور پانچ سو برس تک رہا۔ ۱۹۴۹ء میں ماؤ کا برسرِ اقتدار آنا اس دور کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ مغربی تہذیب جس طرح رومی تہذیب کے خاتمہ کے بعد پیدا ہوئی تھی، اسی طرح اب وہ کسی آنے والی تہذیب کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے۔ (ٹائم، ۸ اپریل ۱۹۷۴)

مستقبل قریب میں مغربی تہذیب کا انہدام یقینی ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا ایک فکری خلا سے دوچار ہوگی جس کو پُر کرنے کے لئے اس وقت کوئی قوم موجود نہیں ہے۔ چین اور روس بظاہر دورِ جدید کے طاقت ور دیو بن کر ابھرے ہیں۔ مگر وہ اس خلا کو پُر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ ان کا اندرونی تضاد ہے۔ اشتراکی ڈکٹیٹر شپ جس نے ان ملکوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنے وسائل کو مخصوص میدانوں میں مرتکز کر کے طاقت ور قوم بن جائیں، وہی اس میں مانع ہے کہ ان ملکوں میں کوئی فکری ارتقاء وجود میں آسکے۔ کلیت پسندانہ نظام کے تحت ٹکنکل علوم ترقی کر سکتے ہیں، مگر فکری علوم، جو قوموں کو امامت کا مقام دیتے ہیں، ان کی ترقی کے لئے آزاد فضا ناگزیر طور پر ضروری ہے جو اشتراکی نظام میں موجود نہیں ہوتی۔

اس کے بعد جاپان ہے۔ بلاشبہ جاپان نے صنعتی ترقی کے میدان میں معجز نما کارنامے دکھائے ہیں۔ مگر جاپان بنیادی طور پر ایک ٹکنکل معاشرہ ہے اور مستقبل بعید تک یہ امید نہیں کہ وہ فکری حیثیت سے کوئی مقام حاصل کر سکے۔

مغربی قوموں کا انہدام، صنعتی تہذیب کے نتائج سے مایوسی اور عمومی فکری خلا نے دینِ حق کے حاملین کو آج اس مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ اگر وہ بیدار ہو جائیں تو اسلام کو دوبارہ نوعِ انسان کی امامت کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں

اس اعلیٰ مقصد کے لئے جدوجہد میں جو واحد چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، وہ جدید صنعتی دور میں وسائل کے اعتبار سے ان کا پیچھے ہو جانا ہے۔ تاہم قدرت نے تیل کے ذخائر کا تین چوتھائی حصہ ان کی زمین کے نیچے رکھ کر حیرت انگیز طور پر ان کی پس ماندگی کی تلافی کر دی ہے۔ آج مسلم دنیا ہر وہ اقتصادی قیمت ادا کر سکتی ہے جو دورِ جدید میں اسلام کے احیاء کی مؤثر جدوجہد کے لئے درکار ہے۔ خدا نے اپنے حصہ کا کام کر دیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بندے اپنے حصہ کا کام کرتے ہیں یا نہیں۔"

(ماخوذ از "الاسلام" صفحہ ۳۷-۲۳۵)

The picture shows Viking's earlier landing site, Chryse, which has now been abandoned as it has nearby a bigger crater than previously known. Another site north-west of the original one is being considered and the landing has been delayed. Viking photographed the crater named Yuty from a 1165-mile altitude. The crater was formed by a collision with a meteorite and is 11 miles in diameter with layers of broken rocks thrown out of the crater by the shock following impact. — (AP)

کائنات بے شمار ستاروں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ ستارے ہماری زمین سے کروڑوں اربوں گنا بڑے آگ کے شعلے ہیں۔ سورج اسی قسم کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ ہے۔ سورج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہم سے قریب ہے اور اس کے گرد زمین اور دوسرے غیر روشن سیارے گھوم رہے ہیں جن کی مجموعی تعداد ۹ ہے، پھر ان سیاروں کے گرد مزید چھوٹے سیارے گردش کر رہے ہیں۔ جن کو چاند کہا جاتا ہے۔ نظام شمسی میں اس قسم کے ۲۹ سیارچے پائے جاتے ہیں۔ ان میں بعض سیارچے مریخ کے حجم کے برابر ہیں۔ سائنس دانوں کا قیاس ہے کہ اس قسم کے سیاراتی نظام ہماری کائنات میں تقریباً ایک سو ملین کی تعداد میں ہیں۔ تاہم ابھی تک کسی دوسرے سیاراتی نظام کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ملا ہے۔

مریخ جس کو ہندی میں منگل اور انگریزی میں مارس

A ROCK LIKE A HUMAN HEAD

The picture above, which was shot on July 25 from a height of 1,873 kilometers, is one of many photographs taken in the northern latitudes of Mars by the Viking I orbiter, when it was searching for a landing site for Viking II. Eroded, mesa-like landforms are visible. What seems to be a human head in the center of the picture is really a huge rock formation in which the play of shadows gives the illusion of eyes, nose and mouth. This rock is about 1.5 kilometers across.

اوپر کی تصویر میں صاف طور پر ایک انسان کا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔ وائکنگ اول نے ۲۵ جولائی ۱۹۷۶ کو مریخ سے یہ تصویر بھیجی تو زمین پر انتظار کرنے والے سائنس دانوں میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ تصویر مریخ پر انسان جیسی مخلوق کی موجودگی کا قطعی ثبوت ہے مگر بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ صرف نظر کا دھوکا تھا۔ مریخ پر انسان کی تصویر ایک چٹان کے سایہ کا کرشمہ ثابت ہوئی۔

مریخ پر زندگی کی تلاش

"بے شمار دنیاؤں کی اس وسیع کائنات میں زمین ایک انوکھا استثنا ر ہے" — خلائی مہموں کی اس دریافت نے حیرت انگیز طور پر خصوصی تخلیق کے نظریہ کو صحیح ثابت کر دیا ہے جس کو ارتقا پسندوں نے سو سال پہلے رد کر دیا تھا

کہتے ہیں، نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے۔ مریخ کا فاصلہ زمین سے ۱۴ کرور ۵۰ لاکھ میل ہے اور اس کا قطر زمین کے مقابلہ میں تقریباً نصف ہے۔ یہ "سرخ ستارہ" قدیم ترین زمانہ سے انسان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ قدیم علم نجوم میں اس کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ موجودہ زمانہ میں مریخ سے دلچسپی کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ سائنس دانوں کا خیال تھا کہ مریخ کے طبیعی حالات ہماری زمین سے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور وہاں زندگی کی کچھ اقسام ضرور پائی جانی چاہئیں۔ ابتدائی مشاہدہ میں مریخ پر کچھ ایسی چیزیں نظر آئیں جن کو برف کا تودہ سمجھا گیا۔ چنانچہ کہا گیا کہ برفانی تودوں کا مطلب ہے پانی اور فضا، فضا کا مطلب ہے آکسیجن اور دونوں کا مطلب ہے زندگی۔

اس نظریہ کی بنیاد کسی حقیقی دریافت سے زیادہ قیاس پر تھی۔ جدید علماء زندگی کو ایک ارتقائی واقعہ فرض کرتے ہیں۔ یعنی مادی اشیاء کے باہمی تعامل سے مخصوص حالات میں زندگی کا ایک ابتدائی شرارہ نکلا اور پھر مختلف مادی حالات کے تحت ارتقا کرتا ہوا موجودہ انواع حیات تک پہنچا۔ اسی کے ساتھ ان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ساری کائنات کا مادہ ایک ہے۔ جو ایٹم ہمارے اندر ہے، ذرّے سے لے کر ستاروں تک تمام کائنات اسی سے بنی ہوئی ہے۔ اسی لئے امریکی فلکیات داں ڈاکٹر ساگن (Dr. CARL SAGAN) نے انسان کو کوکبی مخلوق (STARFOLK) کہا ہے۔ اب اگر زندگی ارتقا کے طبیعی قانون کے تحت بنی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ محض ایک زمینی استثنا رہو۔ اس توجیہہ کا لازمی تقاضا ہے کہ زندگی ایک کائناتی مظہر ہو۔ وہ کائنات کے تمام حصوں میں، اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے، ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی نظر آئے۔ اتنی بڑی کائنات میں صرف ایک چھوٹے سے سیارہ پر زندگی ہو تو وہ ایک شعوری اور ارادی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس زندگی اگر ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہو، تو جدید ذہن کے نزدیک، وہ ارتقاء کی تصدیق کرتی ہوئی نظر آئے گی —— مریخ پر زندگی کی تلاش کا کم از کم فلسفیانہ محرک یہی ہے۔

۱۸۷۷ میں اٹلی کے ایک فلکیات داں شیاپریلی (GIOVANNI SCHIAPARELLI) نے دوربین سے مریخ کا مشاہدہ کیا۔ اس کے مشاہدہ میں بعض ایسی چیزیں آئیں جن کو اس نے اپنی زبان میں کینالی CANALI سے تعبیر کیا۔ اس اطالوی لفظ کا انگریزی مترادف چینل (CHANNELS) ہے۔ مگر انگریزی میں جب یہ خبر چھپی تو اس کا ترجمہ چینل کے بجائے کینال (CANALS) کر دیا گیا۔ چینل قدرتی گزرگاہ کو کہتے ہیں۔ جب کہ کینال کا لفظ انسان کی بنائی ہوئی نہر کے لئے بولا جاتا ہے۔ ترجمہ کی یہ غلطی اتنی عام ہوئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ مریخ پر واقعی انسان جیسی

مخلوق پائی جاتی ہے۔

۱۸۹۴ میں ایک امریکی فلکیات داں پرسیول لاویل (PERCIVAL LOWELL) نے زیادہ گہرائی سے مریخ کا مشاہدہ کیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے اپنے مشاہدہ میں مریخ پر ۵۰۰ نہریں شمار کی ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا: مریخ زندگی کا مسکن:

MARS AS THE ABODE OF LIFE

۱۸۹۶ میں خیالات کا یہ قافلہ اور آگے بڑھا جبکہ برطانیہ کے سائنسی کہانیاں لکھنے والے ایچ۔جی۔ ویلز نے ایک کتاب شائع کی۔ اس کا نام تھا "دنیاؤں کی جنگ"

THE WAR OF THE WORLDS

اس کتاب میں برطانی مصنف نے دکھایا کہ مریخ کے باشندوں نے ہماری دنیا پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ کہانی اتنی مقبول ہوئی کہ امریکی ریڈیو نے ۱۹۳۸ میں اس کو نشر کیا اور اس کے فوراً بعد ہالی وڈ نے ایک فلم بنائی جس میں مریخ کے باشندوں کو عجیب و غریب قسم کے بڑے بڑے جانوروں کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ ۱۹۱۱ میں امریکہ میں ایک ناول چھپی جس کا نام تھا UNDER THE MOONS OF MARS یہ کتاب کروروں کی تعداد میں فروخت ہوگئی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ مریخ پر سرخ انسان، زرد انسان، ہرا انسان وغیرہ مخلوقات پائی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خلائی سائنس کی ترقی نے جب اس کو ممکن بنا دیا کہ مریخ کے حالات کی تحقیق کے لئے زیادہ دوررس تحقیقات کی جاسکیں تو نئے نئے منصوبے شروع ہوئے۔ اس کی تین خاص صورتیں یہ تھیں:

۱۔ بیرونی خلا میں سگنل بھیجنا اور وہاں کا ردعمل معلوم کرنا۔ قیاس یہ تھا کہ زمین سے ایک ہزار سال نور کے اندر جو ستارے واقع ہیں، ان میں کم از کم دس سیارے ایسے ہوسکتے ہیں جن میں ترقی یافتہ تہذیبیں موجود ہوں۔ اور وہ ہمارے سگنل کا جواب دیں۔ پہلی بار پروفیسر ڈریک (DRAKE) نے ۱۹۶۰ میں ستاروں سے مواصلات قائم کرنے کی کوشش کی۔ کائنات میں مفروضہ زندگیوں سے ربط قائم کرنے کے لئے ریڈیو اینٹینا کا رخ قریبی ستاروں کی طرف کر دیا گیا۔ میری لینڈ یونیورسٹی اور شکاگو یونیورسٹی نے ۱۹۷۲ سے ایک مشترکہ پروگرام شروع کر رکھا ہے جس کے ذریعہ گرین بینک کی رصدگاہ (مغربی ورجینیا) سے سات سو قریبی ستاروں تک مسلسل سگنل بھیج کر ان کا جواب سننے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وغیرہ

۲۔ بیرونی خلا سے آنے والے شہابیے (METEORS) حاصل کرنا اور احتیاط کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا کہ شاید ان پر دوسری دنیاؤں کے جراثیم لپٹے ہوئے مل جائیں۔ چاند سے لائے ہوئے ذرات اور ٹکڑوں کو بھی اسی طرح خصوصی آلات کی مدد سے دیکھا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے دوسرے سیاروں پر راکٹ بھیج کر واپس لائے جاتے ہیں اور بغور ان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ شاید ان کے اوپر کوئی کائناتی جرثومہ لپٹ کر آگیا ہو۔

۳۔ تیسری صورت مریخ پر ضروری ساز و سامان سے لیس خلائی جہاز بھیجنا ہے جو وہاں کے قریبی فوٹو بھیجے اور وہاں کی مٹی کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ دے۔ وائکنگ اول اور وائکنگ دوم اسی سلسلے کے مشن تھے جنھوں نے پچھلے سال بہت زیادہ شہرت پائی۔

مریخ پر زندگی کی تلاش کا جدید سلسلہ ۱۹۶۵ میں شروع ہوا جبکہ میرینر (MARINER) نام کی خلائی مشینیں اس کی طرف بھیجی گئیں۔ ان ہموں کا خاص مقصد قریب سے

مریخ کا فوٹو لینا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل امریکی اور سوویت اسپوتنک مریخ کے گرد چکر لگاتے رہے ہیں۔ تاہم وائکنگ اول پہلی انسانی مشین تھی جو جولائی ۱۹۷۶ میں مریخ کی سطح پر اتری۔ اس کے بعد وائکنگ دوم کو ستمبر ۱۹۷۶ میں اس پر اتارا گیا۔

وائکنگ کے لفظی معنی "بحری قزاق" کے ہوتے ہیں۔

۷۰۰ ملین کیلومیٹر کا سفر طے کرکے یہ پیچیدہ مشین گیارہ مہینے میں مریخ پر پہنچی۔ ۴۰ دن تک کام کرنے والی اس مشین کا وزن چار ٹن تھا۔ اس میں تین آٹومیٹک لیبورٹریاں تھیں اور مجموعی طور پر اس کے اندر کل ۹۲۵۰۰ پرزے لگے ہوئے تھے۔ زمین پر کسی لیبورٹری میں جتنے آلات ہوتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ آلات وائکنگ کی لیبورٹری میں تھے۔ اس کے باوجود وہ اتنی چھوٹی تھی کہ کوئی شخص اس پوری لیبورٹری کو بغل میں دبا کر لے جا سکتا تھا۔ وائکنگ کی تیاری پر ایک سو ملین ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ اس کے بعد بجٹ میں اتنی رقم نہ رہی کہ اس میں فلیش لائٹ نصب کی جا سکے۔ کیونکہ وہ بہت قیمتی تھی۔ چنانچہ وائکنگ کو فلیش لائٹ کے بغیر بھیجا گیا۔ امریکی سائنس دانوں نے اس پر قناعت کی کہ وہ صرف دن کے وقت مریخ کی تصویریں حاصل کریں، رات کو اس کا سلسلہ بند رکھیں۔ وائکنگ کے دو قیمتی کیمرے اتنے طاقت ور تھے کہ وہ مریخ پر ایک چیونٹی سے لے کر زرافہ تک کے اجسام کے مکمل فوٹو لے سکتے تھے۔

وائکنگ کی ہر چیز بے حد پیچیدہ حساب سے تعلق رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر اس کو مریخ پر اتارنے کے لئے جو حسابی اندازہ کرنا تھا، اگر اس میں چند میٹر کی بھی غلطی ہو جائے، تو وہ مریخ تک پہنچ کر ہزار کیلومیٹر کی غلطی کی شکل اختیار کر لیتی۔ وائکنگ کو زمین سے ریڈیائی لہروں کے ذریعے کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ یہ نظام اتنا زبردست تھا کہ ۲۵ جولائی کو جب کہ مریخ پر اترنے کے بعد وائکنگ اول کا ۱۰ فٹ لمبا بازو جام ہو گیا، جس کا کام یہ تھا کہ مریخ کی مٹی اٹھا کر اس کو اپنی لیبورٹری میں ڈالے تو پساڈینا کے زمینی مرکز سے ریڈیائی لہروں کے ذریعہ اس کی مشینی غلطی درست کر دی گئی اور بازو دوبارہ کھل کر اپنا کام کرنے لگا۔ اسی طرح وائکنگ کے اترنے کے لئے ابتداءً جو جگہ طے کی گئی تھی، جب اس کی بھیجی ہوئی تصویروں سے معلوم ہوا کہ وہاں گیارہ میل قطر کا ایک گہرا غار ہے، تو وائکنگ کو مقررہ وقت پر اترنے سے روک دیا گیا۔ مزید مطالعہ کے بعد جب دوسری مناسب جگہ متعین ہو گئی تو اس کو اترنے کا "حکم" دیا گیا۔

وائکنگ کو مریخ پر زندگی کی تلاش کے سلسلے میں بہت سے کام انجام دینا تھے۔ اس میں ایسے آلات لگے ہوئے تھے جو مریخ کی سطح پر اکسریز کی بمباری کر سکیں۔ اس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ مریخ کی سطح کا مادہ کن چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک اور آلہ وہاں کے موسمیاتی اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس کی کیمسٹری لیبورٹری کا مقصد یہ تھا کہ وہ کاربن مالیکیول کی تلاش کرے اور یہ پتہ کرے کہ مریخ پر کیا آرگینک مالیکیول کسی شکل میں موجود ہیں۔ یہ آلہ اتنا حساس تھا کہ آرگینک مٹیریل اگر ایک بلین میں ایک کی نسبت سے ہو، تب بھی وہ اس کو پکڑ سکتا تھا۔ وائکنگ میں لگے ہوئے کیمرے "تین ابعادی تصویریں" کھینچ سکتے تھے۔ کوئی جاندار، چھوٹا یا بڑا، ان کے سامنے سے گزرے تو وہ ان کی گرفت سے بچ نہیں سکتا تھا۔

Rilles or channels that might have been formed as fissures split by the uplifting plateau under tension from heat processes below the Martian crust.
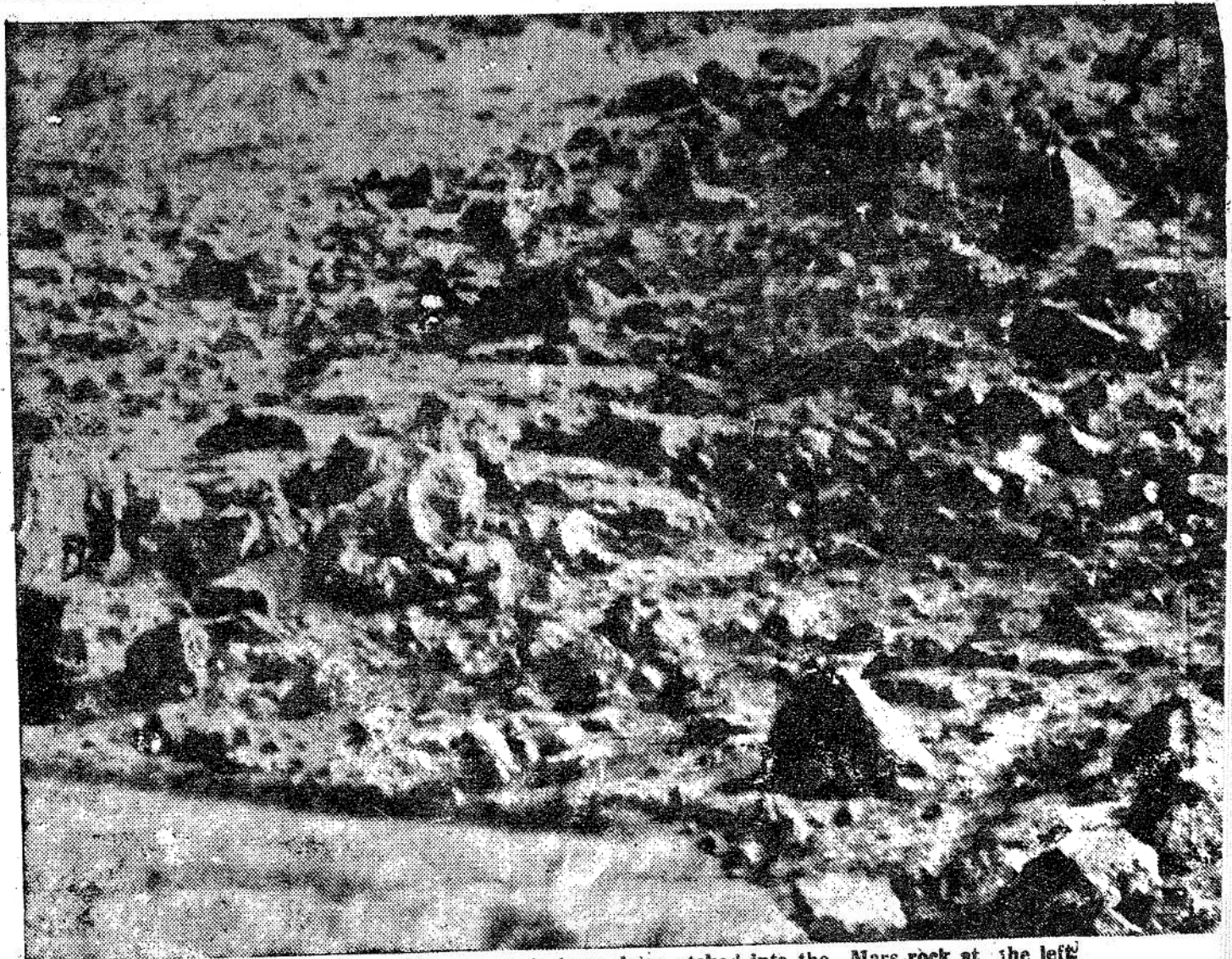
The letter "B" or perhaps the figure "8" appears to have been etched into the Mars rock at the left edge of this picture taken on July 24 by the Viking 1 Lander. It is believed to be an illusion caused by weathering processes and the angle of the sun as it illuminated the scene for the spacecraft camera.

وائکنگ نے مریخ سے تصویریں بھیجنی شروع کیں تو پساڈینا (امریکہ) میں بیٹھے ہوئے سائنس دانوں کا جوش خروش بہت بڑھ گیا۔ ان ابتدائی تصویروں میں انھیں کچھ ایسی چیزیں ملیں جو مریخ پر زندہ اشیاء کی موجودگی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ ۱۰ اگست ۱۹۷۶ کو کچھ تصویریں موصول ہوئیں جن میں بظاہر ایسا منظر تھا جو جوتے ہوئے کھیت کے ہوائی فوٹو میں ہوتا ہے۔ دھاریاں اتنی سیدھی تھیں کہ سائنس دانوں کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ محض فطری اسباب سے بن سکتی ہیں۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا کوئی تعلق ذی شعور مخلوق سے نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی ہیں جیسے صحرا میں ہواؤں کے ذریعہ ریت کے اندر سیدھی دھاریاں بن جاتی ہیں۔

اسی طرح وائکنگ نے کچھ ایسی تصویریں بھیجیں جن میں انسانی حروف اور گنتیاں نظر آ رہی تھیں مثلاً B G 8 وغیرہ۔ اس سے سمجھ لیا گیا کہ مریخ پر انسان جیسی کوئی مخلوق ہے اور اس نے وہاں کی چٹانوں پر یہ حروف اور گنتیاں لکھ رکھی ہیں، مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ محض نظر کا دھوکا تھا۔ اس قسم کے تمام نقوش صرف سایہ کا کرشمہ ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں ایک تصویر ایسی بھی موصول ہوئی جس میں صاف طور پر انسانی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں آنکھ، ناک سب انسان جیسے تھے۔ مگر بعد کی تحقیق میں وہ بھی محض سایہ ثابت ہوا۔

مریخ پر زندگی کی تلاش کے سلسلے میں وائکنگ کا ایک خاص کام یہ تھا کہ وہ اپنے اندر سے دس فٹ کا بازو نکال کر مریخ کی مٹی کھودے اور اس کو اپنی لیبورٹری میں رکھ کر پکائے۔ اس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ مریخ کی سطح پر کاربن پر مبنی آرگینک کمپاؤنڈ ہے یا نہیں۔ زمین پر مٹی کے ہر ٹکڑے میں بے شمار تعداد میں خوردبینی کیڑے موجود رہتے ہیں۔ اگر مٹی کے کسی ٹکڑے کو آگ پر پکایا جائے تو یہ کیڑے جل کر کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کریں گے جو اس بات کا ثبوت ہو گا کہ اس کے اندر زندہ جسم بالفاظ دیگر آرگینک میٹریل موجود تھا۔

وائکنگ کی لیبورٹری کے ذریعہ اسی زمینی تجربہ کو مریخ پر دہرایا گیا۔ مریخ کی مٹی کو اولاً ۵۰ ڈگری سنٹی گریڈ اور اس کے بعد ۲۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ تک گرم کیا گیا۔ مگر اس کے اندر کسی زندہ چیز کا ثبوت نہیں ملا۔ مریخ کی مٹی میں چھوٹے سے چھوٹا خوردبینی کیڑا یا کائی کے مانند بھی کوئی ہریالی ہوتی تو اس عمل سے اس کا پتہ چل جاتا۔

شروع میں جب مریخ کی مٹی لیبورٹری کی بھٹی میں ڈالی گئی جو سورج کی حرارت سے گرمی لے کر اس کو پکاتی تھی تو کسی قدر آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کے اخراج کا نشان ملا۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہ بعض کیمیکل ری ایکشن کی وجہ سے تھا نہ کہ کسی قسم کی زندگی کی وجہ سے۔ وائکنگ کی لیبورٹری میں زندگی کی جانچ کے تین مختلف سائنسی طریقے اختیار کئے گئے، مگر آرگینک کمپاؤنڈ جو زندگی کا بلڈنگ بلاک ہے، مریخ پر دستیاب نہ ہو سکا۔

اسی کے ساتھ وائکنگ میں دوسرے ایسے آلات تھے جو حیاتیاتی اجسام کی صفتیں مثلاً نشوونما، نظام ہضم نظام تنفس کا انتہائی باریکی کے ساتھ پتہ لگا سکتے تھے، مگر ان آلات نے بھی آٹھ ہفتے کی تلاش کے باوجود ایسی کوئی اطلاع نہ دی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ مریخ پر ان خصوصیات کو رکھنے والی کوئی چھوٹی بڑی مخلوق پائی جاتی ہے۔

مریخ کی تحقیق یہ پتہ چلانے کے لئے بھی تھی کہ کیا زمین

سے باہر کی دنیاؤں میں زندگی موجود ہے۔ مگر ان تحقیقات نے مریخ پر زندگی کے بارے میں جدید انسان کی رجائیت کو سخت دھکا پہنچایا ہے۔ کیونکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوا ہے کہ مریخ پر زندگی کم ازکم اس وقت ناممکن ہے۔ اس کی فضا میں پانی کے بخارات کی بہت کم مقدار، اور اس کی سطح پر سیال پانی کا فقدان ایسی باتیں ہیں جو زندہ نظام جسمانی کے لئے اس کو نااہل بنادیتی ہیں۔ شروع میں جب مریخ پر آکسیجن کا انکشاف ہوا تو فوراً مریخ پر زندگی کے بارے میں پُرامید قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ مگر بالآخر ثابت ہوا کہ آکسیجن کی بہت تھوڑی مقدار جو بظاہر مریخ پر پائی جاتی ہے وہ اپنے ماخذ کے اعتبار سے غیر حیاتیاتی ہے۔

"اس قسم کے بیانات کہ مریخ کی فضا میں نائٹروجن کی موجودگی، سیارہ پر زندگی کے موجود ہونے کی توثیق کرسکتی ہے" ایک روسی سائنس داں لیف موخن لکھتا ہے "مجھے حد سے زیادہ عاجلانہ دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ قمری چٹانوں کے گیس کے حامل اجزار کا مطالعہ کرنے پر بھی اسی طرح نائٹروجن دریافت ہوئی تھی"۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ وہاں زندگی کا کوئی وجود نہ ہو اور مریخ کی مٹی اور اس کی فضا کے بارے میں جو کچھ معلوم کیا گیا ہے، وہ سب ایک غیر معمولی ردعمل کا نتیجہ ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مریخ کی سطح پر سخت قسم کی شمسی الٹراوائلٹ شعاع افشانی نے مریخ کی مٹی کی جذب کرنے والی صلاحیتوں کو بدل دیا ہو اور جو کچھ آج ہمارے سامنے ہے وہ بخارات بننے کے سلسلہ ہائے عمل کا نتیجہ ہو۔

فلکی طبیعیات کے مشہور روسی عالم پروفیسر جوزف شکلووسکی (JOSSIF SHKLOVSKY) چند سال پہلے تک اس نظریہ کے زبردست حامی تھے کہ زمین کے علاوہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی ذہین زندگی (انٹیلیجنٹ لائف) موجود ہے۔ مگر اکتوبر ۱۹۷۶ء کے آخر میں سوویت اکیڈمی آف سائنس کے مجلہ میں مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے اپنے اس خیال سے رجوع کرلیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ذہین زندگی کا وجود صرف زمین پر ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کے کسی دوسرے مقام پر ہمارے جیسی ذہین زندگی نہیں پائی جاتی۔ "ذہین زندگی اگر ہماری کہکشاں میں یا ستاروں کے کسی اور نظام میں موجود ہوتی تو خلائی سائنس کے ماہرین اب تک اس کا کوئی متعین ثبوت دریافت کرچکے ہوتے"۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں خلائی سگنل یا اڑن طشتریوں وغیرہ کے مفروضات کے حق میں کوئی علمی بنیاد موجود نہیں ہے۔

اگر انسان نہیں تو اس کی روبوٹ مشین بہرحال مریخ پر پہنچ چکی ہے۔ مگر اس نے پچھلی تمام امیدوں کے خلاف یہ بتایا کہ مریخ پر خشک چٹانوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ بظاہر سائنس فکشن لکھنے والوں کے تمام قیاسات غلط ثابت ہوچکے ہیں۔ تاہم انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ کیمپل مین (KAMPELMAN) نے لکھا کہ مریخ کے جس حصہ پر وائکنگ اترا، وہ اس وقت مریخ کا گرم علاقہ تھا، ظاہر ہے کہ مریخ کے باشندے ان دنوں نسبتاً سرد علاقوں میں منتقل ہوچکے ہوں گے جہاں ان کے لئے پارک اور آرام گاہیں ہیں"۔ ایک اطالوی ادیب باسکولو (RENUCCIO BOSCOLO) نے کہا: وائکنگ نے مریخ کی ایک قدیم تہذیب کے کھنڈرات کی تصویر بھیجی تھی مگر "ناسا" کے افسروں نے اس کو چھپادیا۔ رے بریڈبری (RAY BRADBURY) نے کہا: مریخ کے باشندے وائکنگ کی گرفت میں کیسے آسکتے تھے کیونکہ وہ تو ناقابل مشاہدہ (INVISIBLE) مخلوق ہیں، وغیرہ

بچوں کا گھروندا جتنی دیر میں بنتا ہے اس سے بھی کم مدت میں زمیں بوس ہوجاتا ہے

ایک طالب علم کے سرپرست کالج کے پرنسپل سے ملے — "آپ لوگوں نے جو تعلیمی نصاب بنایا ہے وہ بڑا طویل ہے۔ طالب علم کی عمر کا بڑا حصّہ صرف پڑھنے میں گزر جاتا ہے"، انھوں نے کہا۔

"اس کا حل تو بہت آسان ہے"، پرنسپل نے جواب دیا۔ "آپ مختصر نصاب بھی بنا سکتے ہیں۔ اصل میں مدت کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ طالب علم کے اندر کس درجہ کی لیاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ قدرت کو شاہ بلوط (OAK) کا درخت تیار کرنے میں سو برس لگ جاتے ہیں مگر جب وہ ککڑی اگانا چاہتی ہے تو اس کے لیے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ معمولی قسم کا علمی معیار چاہتے ہوں تو چند سال کی تعلیم بھی کافی ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے تو بہر حال زیادہ وقت دینا پڑے گا۔"

یہی حال قومی تعمیر کا بھی ہے۔ اگر آپ ٹھوس اور دیرپا تعمیر چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو صبر آزما انتظار کے مرحلہ سے گزرنا ہوگا اور لمبے عرصہ تک مسلسل محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر آپ بچّوں کا گھروندا بنانا چاہتے ہوں تو پھر صبح شام میں ایسا گھروندا بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ البتّہ ایسی حالت میں آپ کو اس حادثہ کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ جتنی دیر میں آپ کا گھروندا بن کر کھڑا ہوا ہے اس سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ زمیں بوس ہو جائے۔

ہوائیں چلتی ہیں تو گرد و غبار اٹھ کر فضا میں اڑنے لگتے ہیں مگر گرد و غبار کی پرواز کیلیے آخری طور پر جو انجام مقدر ہے، وہ یہ کہ دوبارہ وہ زمین پر گریں اور قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لیے باقی رہ جائیں۔

مگر یہی ہوائیں پانی کے قطروں کو بھی پرواز پر آمادہ کرتی ہیں۔ مگر یہاں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے قطرے فضا میں جاکر بادل بنتے ہیں، پھر وہ بارش کی شکل میں زمین پر برستے ہیں۔ اس کے بعد نالوں اور ندیوں سے ہوتے ہوئے سمندر میں پہنچتے ہیں اور بالآخر اس عظیم آبی چادر کا حصّہ بن جاتے ہیں جو دائمی طور پر پورے کرۂ ارض کو لپیٹے ہوئے ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری سرگرمیوں کا بھی ہے۔ سطحی اور غیر دانش مندانہ سرگرمیاں انسانوں کو صرف گڑھے میں گرانے کا باعث ہوتی ہیں اور جن سرگرمیوں کی بنیاد گہری بصیرت پر ہوتی ہے وہ آدمی کو ترقی کے آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے درمیان ہم نے اس ملک میں قومی تعمیر کے نام سے زبردست ہنگامہ آرائی کی ہے مگر یہ کوششیں اس انجام پر ختم ہوئی ہیں کہ آج ہم صرف گرد راہ بن کر انسانی قافلوں کے قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لیے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہم کو جدّوجہد کا جو طویل موقع ملا اور اسمیں جو سنہری امکانات ہمارے لیے چھپے ہوئے تھے اگر ہم نے دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا ہوتا تو آج ہم زمین پر چھائے ہوئے ہوتے۔ فریاد و ماتم کے بجائے ہم فیصلہ کرنے والے کی پوزیشن میں ہوتے۔ ہمارے لیے آسمانی پرواز بھی مقدر تھی۔ مگر ہماری بے بصیرتی کی وجہ سے صرف زمین کی پامالی کا انجام ہمارے حصّہ میں آیا ہے۔

شام میں قدیم تہذیب کی دریافت

روم اگر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو اور اچانک اپنی پوری تاریخ کے ساتھ ظاہر ہوجائے تو مورخین کے لئے بلاشبہ یہ انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہوگا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ نوئل فریڈمین DAVID NOEL FREEDMAN کے نزدیک ایسا ہی معاملہ اس قدیم تہذیب کا ہے جس کے آثار شام میں کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر فریڈمین مشی گان یونیورسٹی میں ببلیکل آرکیالوجی کے اُستاد ہیں اور انھوں نے روم یونیورسٹی کے ماہرین علم الآثار کی اس ٹیم کے ساتھ کام کیا تھا جس نے شام کے تل مردیخ میں کھدائی کرکے اس چھپی ہوئی تاریخ کو برآمد کیا ہے۔

یہ واقعہ ستمبر ۱۹۷۵ء میں دنیا کے علم میں آیا۔ اس کھدائی میں سطح زمین سے چار میٹر نیچے ایک قدیم شاہی محل کے کھنڈرات برآمد ہوتے ہیں جس میں ۱۵ ہزار مٹی کی تختیاں ملی ہیں۔ ان تختیوں کا حجم ہاتھ کی ہتھیلی یا اس سے کچھ بڑا ہے۔ ان تختیوں پر قدیم خط میں کتبات لکھے ہوئے ہیں جن کو گیووانی پیٹی ناٹو GIOVANNI PETTINATO نے پڑھا ہے جو قدیم زبانوں کے ماہر ہیں۔ یہ تختیاں ۵۰ سال کی مدت سے تعلق رکھتی ہیں جو ۲۴۰۰ ق م سے ۲۲۵۰ ق م تک پھیلا ہوا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم شامی شہر ابلہ ایک عظیم ترقی یافتہ سلطنت کا مرکز تھا جس کا علاقہ شمال میں بحر احمر سے لے کر موجودہ ترکی تک پھیلا ہوا تھا۔ مشرق میں اس کی سرحدیں میسوپوٹامیہ (عراق) سے ملتی تھیں۔

سمیری، جو کہ ایک غیر سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ۳۰۰۰ ق م میسوپوٹامیا کے جنوب میں آباد تھے۔ قدیم خط مسماری کو ترقی دے کر انھوں نے وہ خط بنایا جس کو خط میخی (CUNEI FORM) کہا جاتا ہے۔ ابلہ کی تختیاں اسی سے ملتے جلتے خط میں لکھی ہوئی پائی گئی ہیں۔

تختیوں کی ۸۰ فی صد تعداد مالی معاہدات سے تعلق رکھتی ہے۔ ان لوگوں کی تجارت آس پاس کے ملکوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ بعض تختیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قبرص میں تانبا برآمد کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاہدے، فوجی روداد یں، مذہبی تحریریں، تخلیق کی کہانی اور "عظیم طوفان" کی باتیں تختیوں میں درج ہیں۔ ان میں بار بار پیغمبروں کے نام بھی آتے ہیں، مثلاً ابراہیم، اسماعیل، اسرائیل، داؤد وغیرہ۔

میسوپوٹامیا والوں نے ۲۲۵۰ ق م میں ابلہ سلطنت پر حملہ کیا اور اس کے شاہی محل میں آگ لگادی۔ اس کے نتیجہ میں محل تباہ ہوگیا۔ تاہم مٹی کی پکائی ہوئی تختیاں آگ سے محفوظ رہیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ ترخ کر ٹوٹ گئیں۔ اس کے بعد عرصہ تک ہوائیں، گرد کی تہیں ان کھنڈرات پر چڑھاتی رہیں چند صدیوں کے بعد یہاں ریت اور مٹی کا اونچا ٹیلہ بن گیا۔ تختیاں اس کے نیچے محفوظ رہیں۔ ان تختیوں کی مالیت کا اندازہ پندرہ ملین ڈالر ہے۔

تختیوں کے ذریعہ جو ملکی قوانین معلوم ہوئے ہیں

ان سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے یہاں زنا کی سزا موت تھی۔

مورخین کا خیال اب تک یہ تھا کہ اس علاقہ میں سب سے قدیم سلطنتیں مصر اور میسوپوٹامیا (عراق) والوں کی تھیں۔ مگر ان تحقیقوں سے انکشاف ہوتا ہے کہ ابلہ (شام) والوں نے بھی تیسری عظیم سلطنت اس علاقہ میں قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس تیسری سلطنت کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ میسوپوٹامیہ والوں کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے ایک تختی کہتی ہے:

"یہ وہ شہر ہے جو انسان کی پیدائش سے لے کر اب تک کبھی مفتوح نہیں ہوا تھا" (اسٹیٹسمین، ۲۱ اگست ۷۶ء)

دین نہ سیاسی مقابلہ آرائی کا نام ہے نہ فراری عملیات کا

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کے درمیان پورے سو سال تک مسلمانوں کے اوپر سیاست کا جنون سوار رہا۔ نہ صرف دنیادار لیڈر بلکہ مقدس بزرگ بھی سیاست کے میدان میں اس طرح ٹوٹ پڑے گویا اس سے بڑا کوئی کام ہی نہیں جس کے لئے وہ متحرک ہوں حتیٰ کہ کچھ پُرجوش داعیوں نے اسلام کی ایسی تشریح کر ڈالی جیسے اسلام نام ہی ہے اسلامی سیاست کا۔

یہ بے معنی سیاست جب اس بے معنی انجام کو پہنچ گئی جہاں اُسے پہنچنا تھا تو اب مسلمانوں کا پنڈولم دوسری انتہا کی طرف جا رہا ہے۔ یہ ہے ٹونے ٹوٹکے کا مذہب۔ "مسجدوں والے اعمال" میں ایسے پُراسرار اوصاف تلاش کر لئے گئے ہیں کہ چھت کے سایہ میں بیٹھ کر اللہ کے بیج پر الفاظ شماری کر و اور مقابلہ کا میدان خود بخود سر ہوتا چلا جائے گا۔

مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی وہ دین نہیں ہے جس کو پیغمبر آخر الزماں خدا کی طرف سے لائے تھے اور جو قرآن کی صورت میں اب بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ دین نہ سیاسی مقابلہ آرائی کا نام ہے اور نہ فراری عملیات کا۔ دین نام ہے دنیا میں رہ کر آخرت کے لئے عمل کرنے کا۔ دین ایک ایسی زندگی ہے جس کو آج کی زبان میں AKHIRAT ORIENTED LIFE کہا جا سکتا ہے۔ یعنی آخرت پسندانہ زندگی۔ ایک ایسی زندگی جس میں تمام سرگرمیوں کا رُخ آخرت کی طرف ہو۔

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم آخرت کے مسافر ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی، ہماری اصل زندگی کا بہت ہی چھوٹا حصہ ہے۔ ہم بہت جلد اپنی دائمی زندگی کے مرحلہ میں داخل ہونے والے ہیں۔ اس حقیقت واقعہ کو یاد رکھنا اور دنیا کے نفع نقصان کے بجائے آخرت کے نفع نقصان کو سامنے رکھ کر زندگی گذارنا اسی کا نام دین یا اسلامی زندگی ہے۔

مسلمان کا کام یہ ہے کہ خود اسی راہ کو اپنائے اور دوسروں کو اسی راستہ کی طرف دعوت دے۔

سب سے بڑا اعتماد خدا پر اعتماد ہے

جس بہادری کا انحصار مادّی سہارے پر ہو، وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب مادّی سہارا چھن جائے

دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادی طاقتوں نے بالآخر جرمنی کو شکست دیدی تو تمام نازی لیڈروں کو اسی برلن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا جہاں وہ ساری دنیا کے قتل کا منصوبہ بنایا کرتے تھے۔

یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۴۶ء کا ہے۔ ہٹلر اور گورنگ نے تو پہلے ہی خودکشی کرلی تھی اس کے بعد ربن ٹراپ، کیٹل، کیلٹن برنر، الفریڈ روزن برگ، ہنس فرینک، ولہم فرک جولیس، ساکل، جوڈل، سس انکوارٹ اور دوسرے نازی لیڈر جو زندہ بچے تھے، ایک ایک کرکے ختم کر دیئے گئے۔

یہ وہ لیڈر تھے جنھوں نے چالیس لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور ان کی املاک پر قبضہ کرلیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسی خونی جنگ چھیڑی تھی جس میں ان کے مفروضہ دشمنوں کے علاوہ خود جرمن قوم کے ۷۰ لاکھ سپاہی کام آئے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو بیگار کیمپوں (CONCENTRATION CAMP) میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے کے لیئے مجبور کر دیا تھا۔ ان کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ملک کے بوڑھے، معذور اور بیمار لوگوں کو "جرمنی کے لیئے بے فائدہ" قرار دے کر گولی سے اڑا دیتے۔ مقتول بچوں، لاشوں سے اٹے ہوئے گڑھوں اور بیواؤں اور یتیموں کے غول دیکھ کر بھی ان کا پتھر جیسا دل پسیجنا نہیں جانتا تھا۔

مگر شکست کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ جب وہ پھانسی کے تختے کے سامنے لائے گئے تو ان کے چہرے زرد تھے، ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، وہ کچھ بولنا چاہتے تو معلوم ہوتا کہ زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ شعلہ بیان لیڈر گویائی کی طاقت کھو بیٹھے تھے۔ جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے تھے، وہ اپنے انجام کو دیکھ کر پاگل ہو گئے تھے۔

جس بہادری کا انحصار صرف مادی سہارے پر ہو، وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب مادی سہارا اس سے چھن جائے۔ البتہ جس کا اعتماد خدائے لازوال پر ہو، وہ ہر حال میں شجاعت و عزیمت کی چٹان بنا رہتا ہے، خواہ مادّی سہارے اس کا ساتھ دے رہے ہوں یا انھوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

مسلمان اس نبی کی امت ہیں جس نے غار ثور میں بیٹھ کر اس وقت لا تحزن ان اللہ معنا کا سبق دیا جبکہ سارے مادی سہارے اس سے چھن چکے تھے اور طاقتور دشمن قتل کی مکمل تیاری کے ساتھ عین غار کے دہانے پر کھڑا ہوا تھا۔ اگر خدا کی مدد کا یہ یقین دلوں میں زندہ ہو جائے تو کبھی آپ مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتے۔ قاتلوں اور غارت گروں کے ہجوم سے بھی آپ اس طرح زندہ سلامت نکل آ سکتے ہیں۔ جیسے وہاں کسی کا وجود ہی نہیں تھا

یہ علوم کیسے بنے

اسلام جب جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اطراف کے علاقوں میں پھیلا تو اس کے ساتھ نئے نئے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ عجمیت ہر طرف سے اسلام پر "حملہ آور" ہو گئی۔ اس وقت انھوں نے قرآن کی زبان کو محفوظ رکھنے کے لئے نحو، اس کے حل مشکلات کے لئے تفسیر، اس سے استنباط احکام کے لئے فقہ مرتب کی۔ حدیث کے تلف ہونے اور اس میں وضعی احادیث کے مل جانے کے خطرہ کی وجہ سے انھوں نے احادیث کو مدون کیا اور اس سے متعلق فنون وضع کئے۔

اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ عربی زبان بھی پھیل رہی تھی۔ اب وہ حجاز و نجد کے قصبات سے نکل کر بصرہ، کوفہ، دمشق، بغداد، قرطبہ اور مصر جیسے متمدن علاقوں کی زبان بن گئی۔ ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کو عربی پر وہ قدرت حاصل نہ تھی جو عربوں کو ہو سکتی تھی، اختلاط کے نتیجہ میں ایک نئی زبان بننے لگی جو خامیوں اور غلطیوں سے بھری ہوئی تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک اگرچہ عرب دیہات کی زبان اپنی خالص حالت پر موجود رہی مگر شہروں کی زبانیں بدل چکی تھیں۔ بعد کو یہ بگاڑ عام ہو گیا۔ مسلمانوں کو خطرہ ہوا کہ کہیں قرآن کی زبان بھی اس سے متاثر نہ ہو جائے۔ انھوں نے اس کی حفاظت کے لئے نحو و صرف کے قواعد بنائے۔ اس کی عبارتوں پر اعراب اور نقطے لگائے۔ اس سے یہ فائدہ تو ہوا کہ کتابی زبان محفوظ رہ گئی۔ مگر بول چال کی زبان کی اصلاح نہ ہو سکی۔ بالآخر عربی زبان کے دو حصے ہو گئے۔ ایک تحریری کی ادبی زبان، دوسری بول چال کی عوامی زبان۔ یہ تقسیم آج تک بلاد عرب میں جاری ہے۔

عربی نحو کے قواعد مرتب کرنے والا سب سے پہلا شخص ابوالاسود دؤلی (م ۶۹ھ) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداءً جب اس نے کوفہ و بصرہ کے گورنر زیاد سے اس فن کو مرتب کرنے کی اجازت مانگی تو اس نے اجازت نہ دی۔ اس کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ ایک شخص زیاد کے پاس آیا اور گفتگو کے دوران کہا: توفی ابانا وترک بنون (صحیح جملہ یوں ہوگا: توفی ابونا وترک بنین) اب زیاد کو احساس ہوا اور اس نے ابوالاسود کو صرف و نحو کے قواعد مرتب کرنے کی اجازت دے دی۔ ابوالاسود دؤلی سریانی زبان جانتا تھا اور اس زبان کی نحو عربی سے قبل مرتب ہو چکی تھی۔ اس کی پیروی کرتے ہوئے اس نے بھی عربی نحو کو سریانی نحو کے قواعد پر مرتب کیا۔

قید رحمت ثابت ہوئی

ابوریحان ابن احمد البیرونی (
خوارزم (موجودہ خیوا) میں پیدا ہوا۔ وہ نوابوں کے دربار سے وابستہ تھا۔ ۱۰۱۷ میں جب محمود غزنوی نے خوارزم میں حکمراں نسل کو ختم کیا تو البیرونی کو بھی اس نے حراست میں لے لیا اور اس کو غزنہ میں رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہ حراست البیرونی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ غزنہ میں اس وقت سنسکرت کے علماء موجود تھے۔ اس نے ان سے سنسکرت زبان سیکھنا شروع کی اور سنسکرت کی کلاسیکل کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کی یہی کوششیں بعد کو اس کی مشہور کتاب "تحقیق الہند" کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

اس میں آپ کے لئے سبق ہے

ابتدائی اسلامی دور کے شعراء میں تین سب سے زیادہ مشہور ہیں: جریر، فرزدق اور اخطل۔ جریر (م ۱۱۰ھ) اور فرزدق (۱۱۰ھ) دونوں ایک دوسرے کی ہجو کیا کرتے تھے۔ مثلاً فرزدق نے کہا:

احلامنا تزن الجبال رزانة
وتخالنا جنّا اذا ما نجهل

ہماری عقلیں پہاڑوں کے برابر وزنی ہیں اور جب ہم بگاڑ پر مائل ہوجائیں تو تم ہم کو جن خیال کروگے۔

جریر نے جواب دیا:

ابلغ بنی وقبان ان حلومهم
خفت فلا یزنون حبة خردل

بنی وقبان کو بتا دو کہ ان کی عقلیں ہلکی ہوگئیں اور وہ رائی کے برابر بھی وزنی نہیں۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے۔ ورنہ ان کی ہجویات خاص طور پر فرزدق کی، اتنی زیادہ عریاں ہیں کہ ان کو نقل بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جریر کے سلسلہ میں یہ قصہ مشہور ہے کہ اس کی ماں نے ایام حمل میں خواب دیکھا کہ اس کے اندر سے ایک رسی نکلی اور لوگوں کے اوپر کودنے لگی اور ایک ایک کا گلا گھونٹنے لگی۔ جب اس نے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کی تو بتانے والوں نے بتایا کہ تجھ سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو لوگوں کی ہجو کیا کرے گا اور ان کے لئے ایک آفت کا باعث ہوگا۔ اسی لئے لڑکے کا نام جریر رکھا گیا جس کے معنی عربی زبان میں رسی کے ہوتے ہیں۔

دو معاصر شعراء کے درمیان ہجو گوئی کیسے شروع ہوئی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جریر بن عطیہ یمامہ میں پیدا ہوا۔ طبیعت کے رجحان اور ماحول کے اثر سے شعروشاعری شروع کردی۔ اس کو معلوم ہوا کہ بصرہ میں شاعروں کی بڑی قدر ہے۔ وہ وہاں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ فرزدق اپنی شاعری کی بدولت بہت بلند مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔ فرزدق کی خوش حالی اور اس کی قدر ومنزلت نے اس کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ دونوں تمیمی تھے۔ تاہم جریر دل ہی دل میں اس سے حسد کرنے لگا۔ مربد کا بازار جریر اور فرزدق کے فخریہ قصائد اور ہجویہ نظموں کا اکھاڑا بن گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی ہجو میں قصائد لکھتے جو "نقائض" کے نام سے مشہور ہوئے۔ تاہم جب عمر کا بالکل آخری حصہ آیا تو دونوں مقابلہ آرائی کو چھوڑ کر عبادت میں مشغول ہوگئے۔

آدمی جب کسی مشغلہ کو اختیار کرتا ہے تو خواہ اس کا محرک جو بھی ہو دھیرے دھیرے وہ اس کی طبیعت بن جاتی ہے اور اس کے اقوال وافعال اسی کے سانچہ میں ڈھل جاتے ہیں۔ جریر اس کی ایک مثال ہے

جریر ایک مرتبہ خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دربار میں پہنچا۔ وہاں عدی بن رقاع عاملی بیٹھے ہوئے تھے۔ خلیفہ نے جریر سے پوچھا: "ان کو پہچانتے ہو"۔ جریر نے کہا: "اے امیر المومنین نہیں"۔ خلیفہ نے بتایا کہ یہ عاملہ خاندان کے فرد ہیں۔ یہ سن کر برجستہ جریر کی زبان سے نکلا: "وہی عاملہ جس کے بارہ میں اللہ فرماتا ہے: عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً (بہت سے چہرے اس دن خستہ ہوں گے، بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے، غاشیہ ۔ ۴)" اس کے بعد ایک ہجو شعر پڑھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جریر اور عدی کے درمیان دشمنی شروع ہوگئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہجویہ نظمیں لکھیں۔

حقائق غالب آئے

پاکستان کے لیڈروں کا خیال تھا کہ برصغیر کے مغرب میں جب وہ مسلم حکومت قائم کرلیں گے تو پورا مغربی ایشیا اور خلیج فارس اور بحر احمر کے گرد واقع تمام ممالک جو انھیں کی طرح مذہباً مسلمان ہیں، ان کے ساتھ ہوں گے اور وہ بقیہ بھارت کے مقابلہ میں چھوٹے ہونے کے باوجود اپنے "بھائیوں" سے مل کر بہت بڑی حیثیت حاصل کرلیں گے۔

صدر ایوب کے زمانہ اقتدار (۱۹۶۹ - ۱۹۵۸) میں یہ امید کسی درجہ میں پوری بھی ہوئی۔ مگر بہت جلد زندگی کے حقائق غالب آگئے۔ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے یہاں پٹرول کا خزانہ برآمد ہوا۔ اب انھیں ضرورت ہوئی کہ اس دولت کے ذریعہ اپنے ملکوں میں ترقیاتی اسکیمیں چلائیں۔ ان کے پاس روپیہ بافراط تھا، مگر فنی واقفیت (TECHNICAL KNOW HOW) کی اسی قدر کمی تھی۔ یہ دوسری چیز انھیں پاکستان نہیں دے سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندستان پچھلے سو برس کی کوششوں کے نتیجہ میں اپنے کو اس قابل بنا چکا تھا کہ وہ مسلم ملکوں کی اس ضرورت کو پورا کرسکے۔ چنانچہ ہندستان کے ماہرین کو آج مسلم ممالک میں زبردست استقبال مل رہا ہے اور پاکستان پس پشت چلا گیا ہے۔

اخباری شہنشاہ

یونسکو نے ۲۰۰ قوموں کے ماس میڈیا کے بارہ میں ایک سروے شائع کیا ہے۔ سروے کے مطابق اگرچہ موجودہ زمانہ میں نشر واشاعت کے ذرائع ترقی کرکے سٹلائٹ کمیونی کیشن کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر عملاً جو صورت حال ہے وہ یہ کہ ٹکنکل اعتبار سے چند ترقی یافتہ قومیں ہی دوسری تمام قوموں کے لئے خبر حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ ۹۰ ملکوں میں قومی نیوز ایجنسیاں ہیں مگر یہ ممالک بھی اپنی ملکی خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچانے کے لئے پانچ عالمی نیوز ایجنسیوں کے محتاج ہیں۔ یہ چار عالمی نیوز ایجنسیاں کسی ملک کی جن خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچاتی ہیں، وہ عام طور پر اس قوم کے برے پہلو اور ان کی غیر نمائندہ خصوصیات ہی ہوتی ہیں ـــــ گویا پانچ نیوز ایجنسیاں تمام اخباری دنیا کی شہنشاہ ہیں۔

انسان اور کچھوا

ہندستان میں سب سے پہلا چڑیا گھر ۱۸۷۵ میں قائم ہوا۔ یہ کلکتہ کے قریب علی پور میں ہے۔ اس کو لوئی شیبو یڈلر نے قائم کیا تھا۔ ۱۸۷۵ میں یہاں ایک کچھوا تھا جس کی عمر اس وقت ۵۰ سال تھی۔ یہ کچھوا آج بھی علی پور زو میں موجود ہے اور اب اس کی عمر ۱۵۰ سال ہو چکی ہے۔ ایک اخباری تصویر (ایوننگ نیوز ۲۹ ستمبر ۱۹۷۵) میں ایک لڑکے کو کچھوے کے اوپر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ انسان کچھوے کی طرح ۱۵۰ سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر انسان کا ایک بچہ کچھوے کی پیٹھ پر سوار ہو سکتا ہے۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا کے سیاہ فام قدیم باشندے تقریباً ۲۵ ہزار سال پہلے اس براعظم میں آئے تھے۔ علم الانسان کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ پیدل چل کر یہاں پہنچے تھے جب کہ آسٹریلیا، نیوگنی اور ایشیا سے ملا ہوا تھا۔ اس کے بعد آسٹریلیا کٹ کر دور چلا گیا۔ یہ قدیم باشندے اب بھی ۱۴۰۰۰ کی تعداد میں موجود ہیں۔ یعنی کل آبادی (۱۳۲۶۸۶۰۰) کا ایک فی صد حصہ۔

آسٹریلیا کا رقبہ ہندستان کے مقابلہ میں دگنا سے بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی آبادی ممبئی اور کلکتہ کی مجموعی آبادی سے بھی کم ہے۔ ۱۷۸۸ میں جب برطانیہ کے کچھ مجرموں کو بطور سزا اس مقام پر لاکر ڈالا گیا جہاں آج سڈنی ہے، تو اس وقت یہاں کھانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مایوسی اور جھنجلاہٹ میں یہ لوگ آپس میں لڑلڑ کر مرنے لگے۔ مگر آج آسٹریلیا ایک مکمل طور پر خودکفیل براعظم ہے۔ وہ ۴۰۰ کروڑ روپے کا گیہوں ہر سال برآمد کرتا ہے اور دنیا کی اون کی کل پیداوار کا چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر سے بھرپور اس ملک کے باشندوں کا معیار زندگی دنیا کے انتہائی چند ترقی یافتہ ملکوں میں سے ایک ہے۔

ایک انسانی کمزوری

لارڈ ریتھ (۱۹۷۱ — ۱۸۹۰) بی بی سی لندن کے "فادر" کہے جاتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اور انھوں نے برطانی عوام کے اندر غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

۵۲۵ صفحات پر مشتمل ان کی ذاتی ڈائری THE REITH DIARIES شائع ہوئی ہے۔ ڈائری میں حیرت انگیز طور پر وہ ہٹلر (۱۹۴۵ — ۱۸۸۹) کے لئے شاندار کارکردگی (MAGNIFICIENT EFFICIENCY) کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس خود اپنے ملک کے لارڈ ونسٹن چرچل (— ۱۸۷۴) کے لئے ان کے پاس مکار (IMPOSTER) اور خبطی (LUNATIC) کے الفاظ ہیں۔

اس فرق کی وجہ ہم کو خود ان کے اعتراف میں مل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک انتہائی قسم کا خود پسند (SELF-CENTERED) آدمی ہوں۔ بہت کم ایسا ہو سکتا ہے کہ میں کسی دوسرے کے اندر بڑائی کا اعتراف کروں:

I WII RARELY ADMIT GREATNESS IN OTHERS

لارڈ چرچل نے برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کا مقام حاصل کر لیا۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے لئے لارڈ ریتھ اپنے آپ کو سب سے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ چرچل کا تصور آتے ہی ان کے اندر حریفانہ نفسیات کام کرنے لگتی تھی، جبکہ ہٹلر ان کے لئے ایک غیر متعلق شخص تھا، ہٹلر کا نام ان کے اندر معاصرانہ نفسیات پیدا نہیں کرتا تھا —— یہ تھی سادہ سی وجہ مذکورہ بالا فرق کی۔

میں سوچ رہا ہوں

راجہ راؤ ایک میسوری برہمن ہیں اور ہندستان کے مشہور فلسفی ہیں۔ ہندستان میں اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۹ میں وہ مزید مطالعہ کے لئے پیرس گئے۔ اور ۱۹۵۰ میں پہلی بار امریکہ کا سفر کیا۔ ۱۹۷۳ میں امریکہ کی ٹیکسس یونیورسٹی میں ان کو فلسفہ کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا۔ اس قیام کے دوران ایک امریکی مصنفہ الزبتھ ووہل نے ان سے مفصل انٹرویو لیا۔ الزبتھ ووہل دوبار ہندستان آچکی ہیں۔ انٹرویو کا ایک فقرہ یہ ہے:

راؤ اپنی ذہنی زندگی کی حفاظت کرنے میں بڑے مستعد ہیں۔ وہ بغیر کسی احساس ندامت کے محض اس بنا پر کسی ملاقاتی سے ملنے سے انکار کرسکتے ہیں کہ وہ "سوچ" رہے ہیں۔

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ یہ کہنے کے لئے بھی امریکہ کی سرزمین چاہیے۔ ہندستان میں اگر کوئی ایسا کہے تو اس کو پاگل کا خطاب ملے گا یا مغرور کا۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنی ناکامی کے راز کو سمجھ لے

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

مسلم عہد کا علمی و تصنیفی کام

مسلم عہد کے علماء زیادہ تر بیرونی علماء کی تفسیروں سے خوشہ چینی کرتے رہے اور ان کے ہم پایہ تفسیریں نہ لکھ سکے اور جو لکھیں وہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے خواص تک محدود رہیں۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کی زبان فارسی رہی، مگر اس زبان میں کلام پاک کا ترجمہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے تقریباً ساڑھے پانچسو برس بعد شاہ ولی اللہ نے پہلی دفعہ کیا، اور جب انھوں نے اس دولت کو عام کیا تو کم سواد علماء نے اس کے خلاف شورشیں برپا کیں۔

ہندستان کے علماء کا سب سے محبوب موضوع فقہ رہا ہے، اور جو علماء باہر سے یہاں آئے وہ مفسر اور محدث ہونے کے بجائے زیادہ تر فقیہ رہے، ان کو سلاطین اور امراء کا تقرب آسانی سے حاصل ہو جاتا تھا، کیونکہ وہ مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان میں اسلام زیادہ تر فقہا کے ذریعہ سمجھا گیا جو عموماً اپنی سختی اور درشتی کے لیے مشہور ہیں۔ اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندستان میں اسلام مفسرین اور محدثین کے ذریعہ سمجھا جاتا تو زیادہ موثر ہوتا، فقہ کی اس مقبولیت کے باوجود اہل قلم فقہا زیادہ تر فقہ کی بیرونی کتابوں کے حواشی لکھتے رہے۔ فتاوی تاتارخانی اور فتاوائے عالمگیری ہندوستان کے بڑے اہم فقہی کارنامے ہیں، ان دونوں کی تدوین ایک امیر اور ایک بادشاہ کے ذریعہ ہی سے ہوئی۔

انھیں کام کے بہترین مواقع حاصل تھے، مگر

ہندستان میں ہر قسم کی سرپرستی کے باوجود کوئی امام غزالی، یا ابن قیم، یا ابن مسکویہ، یا ابن خلدون پیدا نہ ہو سکا، حالانکہ جہاں تک بادشاہوں کا تعلق ہے، ان میں بہت سے ایسے گزرے ہیں جو دنیا کے بڑے سے بڑے حکمرانوں کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں۔ مغل بادشاہوں کی حکومت اپنے عروج کے زمانے میں دنیا کی طاقتور ترین اور متمدن ترین حکومت سمجھی جاتی تھی۔ اگر ہندستان کے علماء بھی اسی درجہ کے اور اسلامی ممالک کے علماء کے ہم پایہ ہوتے تو ہندستان کے مسلمانوں کی دینی، ذہنی، نظری اور فکری نشوونما اور نہج پر ہوتی۔ جب یورپ میں محققین ہر قسم کے علوم و فنون پر کتابیں لکھ کر نئے نظام حیات اور نئے مقصد زندگی کے لیے اپنی اپنی قوموں کو تیار کر رہے تھے۔ اس وقت ہندستان کے علماء صرف ایسی کتابیں لکھتے رہے جن سے عام مسلمان زیادہ مستفیض نہیں ہو سکے، اور پھر یہ عجیب بات رہی کہ مذہبی زبان عربی تھی، سلاطین اور امراء کی زبان ترکی یا فارسی تھی۔ اور عوام خصوصاً ہندی الاصل مسلمان یہاں کے باشندوں کے میل جول سے ایک نئی زبان بولنے کے عادی ہو رہے تھے۔ علماء یا تو عربی یا فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے جس کی زبان اتنی مشکل ہوتی کہ وہ جو کچھ لکھتے خواص ہی تک محدود رہ جاتا، اور پھر ان میں بھی جو چیز ہوتی وہ صرف تقلید جامد۔

زلزلہ

۱۹۶۷ء میں کوئنا کے مقام پر جو زلزلہ آیا تھا، اس کے نتیجہ میں وہاں کے بجلی گھر کو اس قدر نقصان پہنچا کہ پندرہ دن تک بجلی نہ رہی اور تقریباً ایک کرور روپے کی صنعتی پیداوار کا نقصان ہوا۔ دیگر نقصانات اس کے علاوہ تھے۔

یہ نسبتاً ایک معمولی زلزلے کا نقصان تھا اس سے کہیں زیادہ بڑے زلزلے دنیا کے مختلف مقامات پر آتے رہتے ہیں اور انسانی تمدن کو اس طرح تہس نہس کر دیتے ہیں گویا قدرت کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہیں

زلزلے کو روکنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ تاہم سائنس داں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس کا وقت اور مقام پہلے سے معلوم کر لیں تاکہ جان و مال کے نقصان سے بچنے کی تدبیر کی جا سکے۔ اس مقصد کے لئے زلزلہ کی ایک انجینئرنگ وجود میں آچکی ہے۔ مگر ابھی تک اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ زیادہ سے زیادہ جو ہو سکا ہے، وہ یہ کہ سائنس دانوں نے مستقبل میں آنے والے زلزلوں کے امکانی مراکز کسی حد تک معلوم کر لئے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ان مقامات پر جو عمارتیں وغیرہ بنیں، ان کو اس انداز سے بنایا جائے کہ زلزلے کے معمولی جھٹکوں سے انھیں نقصان نہ پہنچے۔

زلزلے کی مدت عام طور پر پانچ دس سیکنڈ ہوتی ہے اور اس تھوڑی سی مدت میں اگر لوگ بچ نکلیں تو ٹھیک ہے نہیں تو لاکھوں افراد ہلاک اور بے گھر ہو جاتے ہیں روس اور امریکہ و جاپان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زلزلے کا وقت اور مقام پہلے سے معلوم کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں زلزلے کی علامتوں کا مطالعہ کیا گیا ہے مگر کوئی ایک علامت ایسی نہیں جس کی مدد سے ہر بار زلزلے کی پیشین گوئی کی جا سکے۔ زلزلہ قدرت کا ایک ناقابل پیشین گوئی حادثہ ہے، آج بھی اور پہلے بھی۔

موت کے خوف نے ان سے زندگی کی راحتیں چھین لیں

۲۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو شمال مشرقی چین میں زلزلہ آیا۔ چین کا تیسرا سب سے بڑا صنعتی شہر ٹنگشین جس کی آبادی دس لاکھ تھی، کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔ زلزلہ اتنا شدید تھا کہ اسکے جھٹکے جاپان اور کوریا تک محسوس کئے گئے

چین کی راجدھانی پیکنگ زلزلہ زدہ شہر سے تقریباً ۴۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ تاہم لوگوں کے خوف و ہراس کا عالم یہ تھا کہ پیکنگ کی ۶۰ لاکھ آبادی نے ممکنہ موت کے ڈر سے اپنے مکانات چھوڑ دیئے اور کئی راتیں سڑکوں اور پارکوں میں گزاریں جبکہ ان کے سروں پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

ایک مسئلہ

ابن ماجہ اور ترمذی کی روایت ہے ۔ لا نکاح الا بولی (ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں) اس حدیث سے بعض فقہا نے استدلال کیا ہے کہ عورت کے نکاح کے لئے ولی کی اجازت لازماً ضروری ہے۔ اس کی تائید میں قرآن کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ہے :

فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

عورتوں کو اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے ہرگز نہ روکو، اگر وہ آپس میں نیکی کے ساتھ راضی ہو چکے ہیں

کہا جاتا ہے کہ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ معقل بن یسار رضا صحابی کی بہن کو ان کے شوہر نے طلاق رجعی دی تھی ۔ مگر عدت کے زمانہ میں شوہر دوبارہ ان کو اپنی زوجیت میں لانا چاہتا تھا ، وہ خاتون بھی یہی چاہتی تھیں ۔ مگر ان کے بھائی دوبارہ ان کو نکاح کی اجازت نہیں دے رہے تھے ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اولیاء کو عورت کی مرضی کے خلاف نہ کرنا چاہئے۔

امام شافعی اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ولی کو روکنے کا حق نہ ہوتا تو معقل بن یسار کیوں انھیں روکتے اور کیونکر روک سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ولی کو روکنے کا حق حاصل ہے ۔

مفتی محمد عبدہ اس استدلال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " اس آیت سے تو اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی مرضی کے خلاف مرد کو روکنے کا حق نہیں ہے ۔ اس واقعہ کی اصلیت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مردوں کو عورتوں پر جو ظالمانہ حقوق حاصل تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ جس سے چاہتے تھے ان کا نکاح کر دیتے تھے اور جس سے چاہتے تھے نہیں کرتے تھے ۔ حضرت معقل بن یسار نے اسی رواج کے مطابق اپنی بہن کی شادی کو روکنا چاہا ۔ مگر قرآن نے اس آیت کے ذریعہ اس رواج کو توڑ کر عورتوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کریں۔

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، وہ اگرچہ سنداً زیادہ قوی نہیں ۔ تاہم اس سے قطع نظر، اس سے ایک معنی یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ "نہیں ہے کوئی نکاح مگر بذریعہ ولی کے"۔ یعنی عورتوں کا نکاح باعتبار مقررہ طریق عمل، ولی کے ذریعہ منعقد ہونا چاہئے۔ اس سے لازماً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ولی کی رضامندی یا اجازت بذات خود ضروری ہے ۔ ولی، نکاح کے عمل میں، وکیل یا ایجنٹ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور وکیل یا ایجنٹ کی ضرورت اس لئے ہے کہ عورتیں مجمع عام میں مردوں کے سامنے اپنی زبان سے رضامندی کے کلمات ادا کرتے ہوئے عموماً شرم محسوس کرتی ہیں ۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے کوئی رشتہ دار یا خاندان کا بزرگ ان کی ترجمانی کرے ۔ تاہم اگر کوئی لڑکی ولی کی وساطت اور اجازت کے بغیر خود اپنا نکاح کرلے اور خود رضامندی کے کلمات کہہ دے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔

ان الرجل ليتكلم بالكلمة لا يرى بها بأسا يهوي بها سبعين خريفا من النار (بخاری، مسلم، ترمذی)

آدمی ایک بات کہتا ہے اور اس کے کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا ۔ مگر اس کی وجہ سے وہ ستر سال تک جہنم میں جلتا ہے

سیاست کے لئے جوش وخروش
دعوت کے لئے سرد مہری

ضیاء الدین احمد برنی، مولانا محمد علی جوہر کے رفیق خاص تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے مولانا محمد علی جوہر کو بہت پریشان رکھا۔ وہ ترکوں کی پے در پے ہزیمتوں سے بے حد مغموم تھے۔ انھوں نے ان کے مصائب کو ہلکا کرنے کی غرض سے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں طبی مشن روانہ کیا۔ پہلی جنگ بلقان (۱۹۱۸) کے بعد جب فاتحین میں تقسیم غنیمت پر جھگڑا ہوا، اور دوسری جنگ بلقان برپا ہوئی تو اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ترکوں نے اڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس وقت عالم اسلام میں غیر معمولی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ خبر جب رائٹر کے ذریعہ دہلی پہنچی تو اس وقت رات بہت زیادہ گزر چکی تھی مگر مولانا کی ترک دوستی کا اندازہ کیجئے کہ انھوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ یہ خبر دوسری صبح کو اخبارات کے ذریعے لوگوں تک پہنچے۔ چند رفقاء کار کو لے کر سیدھے جامع مسجد پہنچے اور راستے بھر چلا چلا کر مسلمانوں کو یہ روح افزا خبر پہنچاتے رہے۔ ناوقت ہونے کے باوجود جامع مسجد میں ہزارہا آدمیوں کا اجتماع ہوگیا۔ مولانا نے وہاں دردانگیز تقریر کر کے اس خبر کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہ رات بھی کیسی ہیجان انگیز تھی۔"

مولانا محمد علی، (۱۹۷۶ء) مرتبہ سید نظر برنی، صفحہ ۸۹

ہماری جدید تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے جو بتاتے ہیں کہ سیاسی اور جذباتی امور کے لیے مسلمانوں میں کس قدر جوش و خروش پیدا ہوگیا تھا۔ مگر خدا کے دین کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کے لیے ان میں کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ "رائٹر" کی سیاسی خبریں انھیں بے چین کردیتی تھیں۔ مگر قرآن کی اُخروی خبروں نے انھیں بے قرار نہیں کیا کہ اس کے لیے وہ اپنے گھروں سے نکل پڑتے اور ساری قوموں کو بتاتے کہ اے لوگو تم مرنے والے ہو اور مرنے کے بعد تم کو خدا کے یہاں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

موجودہ زمانے میں بے شمار قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کی بربادی کی واحد وجہ یہی ہے کہ انھوں نے پیغام بری کا وہ کام نہ کیا جو خدا نے ان کے اوپر فرض کیا تھا اور ظاہر ہے کہ جو خادم اپنی اصل ڈیوٹی سے ہٹ جائے وہ خواہ کسی اور کام میں کتنی ہی جانفشانی دکھائے، بہرحال وہ سزا کا مستحق ہوگا نہ کہ انعام کا۔

رسول اللہ نے فرمایا

انکم ستختلفون من بعدی۔ فما جاء کم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ، فما وافقہ فمنی وما خالفہ فلیس عنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد تم لوگ اختلافات میں پڑو گے۔ پس میری جو بات تمہیں پہنچے اس کو خدا کی کتاب کی روشنی میں دیکھنا جو اس کے مطابق ہے وہ میری طرف سے ہے جو اس کے خلاف ہے، وہ میری طرف سے نہیں

یہ کوئی مسئلہ نہیں

کہا جاتا ہے کہ جدید تہذیب نے مذہب کو فرسودہ اور غیر ضروری ثابت کر دیا ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو مغربی تہذیب نے انسانیت کو دی ہے۔ وہ ہیں جدید طرز کی سواریاں۔ نئے طرز کے مکانات، نئے قسم کے ذرائع مواصلات، نئے قسم کے لباس مختصر یہ کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے نئے ساز و سامان جو پچھلے سامانوں کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ، زیادہ خوش نما اور زیادہ سریع العمل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان سامانوں اور اسباب و ذرائع کا خدا اور مذہب پر عقیدہ رکھنے یا نہ رکھنے کے مسئلہ سے کیا تعلق۔

کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور موٹر کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے خدا کا وجود بے معنی ہو گیا۔ کیا تار اور ٹیلی فون کے ذریعہ خبر رسانی سے وحی و الہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے۔ کیا ہوائی جہاز اور راکٹ کے ذریعہ فضا میں اڑنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات میں کہیں وجود نہیں ہے۔ کیا لذیذ کھانے، خوش نما لباس اور اعلیٰ فرنیچر کے وجود میں آنے کے بعد جنت و دوزخ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیا جدید عورتوں کے اندر یہ صلاحیت کہ وہ ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر اپنی انگلیاں تیزی سے چلا سکتی ہیں، یہ ثابت کرتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ کی آیت منسوخ ہو گئی۔ کیا اسمبلی اور پارلیمنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کا قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ تشریعی قانون موجودہ زمانے میں بے معنی ہو گیا ہے۔

نئے ساز و سامان اور نئے ذرائع و وسائل کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کا مذہب کی صداقتوں کی تائید یا تردید سے کیا تعلق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید تہذیب کے لوازم کا مذہب سے ٹکراؤ باعتبار حقیقت نہیں ہے بلکہ انسان کی سطحیت نے اس کو پیدا کیا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری سطحی چیزوں سے لگاؤ اور ظاہری اشیاء کو اصل اہمیت کی چیز سمجھ لینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فطرت کے چھپے ہوئے راز سامنے آئے اور عیش و عشرت اور زیبائش و آرائش کے سامان حاصل ہونے لگے تو انسان ان میں اتنا محو ہوا کہ سمجھنے لگا کہ بس اب اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دنیوی ساز و سامان کے سوا ہر چیز اس کی نظر میں غیر اہم بن گئی۔

ایک اقتباس

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲-۱۷۰۳) نے حجۃ اللہ البالغہ (باب الفتن) میں لکھا ہے:

فیری الانسان اظرف مایکون واعقلہ و لیس فی قلبہ مقدار شیئ من الامانۃ لا بالنسبۃ الی دین اللہ ولا بالنسبۃ الی معاملات الناس (آدمی بعض اوقات بڑا عالی ظرف اور عقلمند دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کے دل میں امانت کا ایک ادنیٰ جزو بھی نہیں ہوتا۔ نہ تو دین الٰہی کے اعتبار سے اور نہ لوگوں کے باہمی معاملات کے اعتبار سے۔

کوڑا بھی بیکار نہیں

ہر شہر میں صبح کو یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ میونسپلٹی کے ملازمین شہر کا تمام کوڑا اکٹھا کرتے ہیں اور گاڑیوں میں لاد کر اس کو باہر پھینک آتے ہیں۔ گھریلو گندگی، صنعتی ٹوٹ پھوٹ، استعمال شدہ چیزیں، کاغذ، دھات اور پلاسٹک وغیرہ کے ٹکڑے ہماری زبان میں صرف "کوڑا" ہیں۔ عام تصور کے مطابق ان کا واحد مصرف یہ ہے کہ انھیں جمع کر کے کسی گڑھے میں دفن کر دیا جائے۔

مگر مغربی دانشوروں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس کوڑے کرکٹ کے اندر ایک عظیم طاقت چھپی ہوئی ہے اور وہ ان کی وہ حرارت ہے جس کی مجموعی مقدار ۵،۳۱ سے ۳۰، ۸۷ برٹش تھرمل یونٹ (B. T. U) فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

اس دریافت نے یکایک کوڑے کرکٹ کو وہ مقام دے دیا جو کوئلہ اور پٹرول کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یورپ میں ایک نئی ٹیکنک وجود میں آئی جس کو گاربیج بوائلر (GARBAGE BOILER) کہتے ہیں۔ یورپ کے بہت سے شہروں میں اس اسکیم کے تحت خاص طرح کے بوائلر اور بھٹیاں تیار کی گئی ہیں شہر کا تمام گھریلو اور صنعتی کوڑا حتیٰ کہ ٹوٹے ہوئے فرنیچر اور سائیکل تک وہاں لا کر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہ گندگی اور ردی جیسی چیزیں بوائلر کی بھٹی میں جلائی جاتی ہیں اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے جو اسٹیم بناتی ہے اور اسٹیم سے الکٹرک جنریٹر کو حرکت دے کر بجلی پیدا کی جاتی ہے اس طرح کوڑے کرکٹ کو بالآخر بجلی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو دورِ جدید کی سب سے بڑی قوت ہے، جو موجودہ زمانے میں پورے انسانی تمدن کو متحرک کئے ہوئے ہے۔

کوڑا عام حالات میں صرف کوڑا ہے، مگر جب اس پر دانش مندی اور محنت کا اضافہ کیا جائے تو وہ بجلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز اس دنیا میں نہیں۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں اتنے بے پناہ امکانات رکھے ہیں کہ یہاں کوڑا بھی بیکار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی قوم اتنی پستی میں پہنچا دی جائے کہ لوگ اسے "انسانی کوڑا" سمجھنے لگیں، جب بھی خدا کی اس کائنات میں اس کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ وہ کوڑے خانے سے نکل کر انتہائی بلند مقام پر پہنچ سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے اندرونی امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے محنت اور دانش مندی کا وہ عمل کرے جو گاربیج بوائلر کی مثال میں نظر آتا ہے ★★★★★

قرآن کے بارے میں

"میں نے قرآن کا مطالعہ کیا مجھے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ یہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔" (گاندھی)

"وہ وقت دور نہیں جب کہ قرآن اپنی ناقابل انکار صداقت اور روحانیت کے ذریعہ سب مذاہب کو اپنے اندر جذب کر لے" (ٹیگور)

"میں نے توریت انجیل اور وید سب پڑھے مگر قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو سب سے زیادہ اعلیٰ و ارفع ثابت ہوئی۔ (گورونانک)

طاقت کا خزانہ آپکے اندر ہے

نپولین کا نام فوجی تاریخ میں عظمت کا نشان ہے۔ مگر وہ ایک پستہ قد آدمی تھا اگرچہ فربہ اندام تھا۔ ایک دن وہ پریڈ گراؤنڈ میں معمولی لباس میں کھڑا تھا اتنے میں اس کا ایک فوجی پیچھے سے آیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ کوئی معمولی سپاہی ہے، نپولین کے اوپر سے ہائی جمپ کر گیا۔ اس کے بعد وہ فخریہ انداز میں پلٹا اور کھڑے والے شخص کے سامنے سے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی تو وہ نپولین تھا جو سنجیدگی کے ساتھ اپنے فوجی کی طرف دیکھ رہا تھا فوجی نے جب اسطرح اچانک اپنے عظیم کمانڈر نپولین کو دیکھا تو وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا اور فوراً مر گیا۔

معلوم ہوا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ خود آدمی کا اپنا احساس ہے۔ وہی نپولین ہے اور وہی فوجی۔ مگر ایک بار وہ نپولین کے سر سے فخریہ انداز میں پھاند جاتا ہے اور دوسری بار اس کو دیکھتے ہی اتنا بدحواس ہوتا ہے کہ فوراً مر جاتا ہے۔

یہ دونوں احساس کے کرشمے ہیں اگر آپ کا دل بے خوف ہے تو آپ شیر سے لڑ سکتے ہیں اور دریاؤں کو پھلانگ سکتے ہیں۔ لیکن اگر دل میں شبہ اور دہشت پڑا ہوا تو گیدڑوں کا غول بھی آپ کو بوکھلا دے گا اور معمولی نہریں بھی آپ کو ڈبانے کے لیے کافی ہوں گی۔

اوپر ہم نے نپولین کے فوجی کی جو مثال پیش کی ہے، وہ اس صورت حال سے متعلق تھی کہ ایک طاقتور شخص کس طرح دل کی گھبراہٹ کی وجہ سے اپنی موجودہ طاقت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اب ایک ایسی مثال لیجیے جبکہ ایک کمزور اور شکست خوردہ آدمی محض دل کی کیفیت بدل جانے کی وجہ سے دوبارہ فتح و کامیابی کا مالک بن جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے رابرٹ بروس (ROBERT BRUCE) نے انگلینڈ کے بادشاہ کنگ ایڈورڈ اول کے خلاف بغاوت کر دی تھی جو کہ اسکاٹ لینڈ کے اوپر اقتدار اعلیٰ کا دعویدار تھا اس کو ۱۳۰۶ء میں "کنگ آف اسکاٹ لینڈ" کا تاج پہنایا گیا۔

اس مقابلہ میں رابرٹ بروس کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کو جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لینا پڑی۔ مگر ۱۳۱۴ء میں اس نے دوبارہ انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ دوم سے بناک برن میں جنگ کی اور اس کو شکست دی۔ اور اسکاٹ لینڈ کو انگریزوں سے آزاد کرالیا۔ اس کے بعد "رابرٹ اول" کے نام سے اس نے ۱۳۲۹ء تک اسکاٹ لینڈ پر حکومت کی۔

رابرٹ بروس کو شکست کے بعد فتح کس طرح حاصل ہوئی اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک جنگل کے اندر کسی غار میں پڑا ہوا تھا۔ "مجھے اب انگلینڈ کے بادشاہ سے مقابلہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے" اس نے سوچا۔ اس کو اپنی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کئی بار کے مقابلہ کے بعد بالآخر وہ مایوس ہو چکا تھا۔

اتنے میں غار کے اندر ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ایک مکڑی اپنے جالے کے باریک تار سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ رابرٹ بروس کی نظریں اس کے اوپر جم گئیں۔ اس نے دیکھا کہ مکڑی نے اپنا ایک منٹ ضائع نہیں کیا۔ اور لٹکتے ہوئے تار کے ذریعے دوبارہ اوپر چڑھنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ مگر چھت کے قریب پہنچتے ہی وہ دوبارہ پھسل کر گر پڑی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح زمین پر پڑی ہوئی تھی اس طرح وہ بار بار چڑھتی اور بار بار گرتی رہی۔ مگر وہ

ہمت نہیں ہاری اور ہر بار دوبارہ اسی کام میں مشغول ہو جاتی جس میں وہ اس سے پہلے ناکام ہو چکی تھی۔

رابرٹ بروس اس کے ناکام تجربات کو گنتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ نویں بار زمین پر گری تو اس کو ہنسی آگئی۔ "اب یہ کیڑا مزید کوشش کی حماقت نہیں کرے گا" اس نے کہا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مکڑی نے ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دسویں بار پھر اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس بار رابرٹ بروس کے سامنے دوسرا منظر تھا اس نے دیکھا کہ مکڑی منزل سے بہت قریب پہنچ گئی ہے وہ دھیرے دھیرے چڑھتی رہی یہاں تک کہ جب فاصلہ بہت قریب آگیا تو اس نے آخری چھلانگ لگائی اب وہ اپنے جالدار مکان کے اندر تھی۔

"خوب" رابرٹ بروس چلایا "وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ہمت نہ ہاریں اور مسلسل اپنی جدوجہد جاری رکھیں"۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر بولا "ایک معمولی کیڑے نے مسلسل کوشش سے اپنی بازی جیت لی۔ پھر میں کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔"

رابرٹ بروس غار سے نکل کر باہر آیا۔ اس نے آخری فیصلہ کن مقابلہ کے لئے تیاری شروع کر دی۔ وہ نئے عزم کے ساتھ شاہ انگلینڈ سے لڑا اور اس بار اس نے فتح حاصل کر لی۔

حقیقت یہ ہے کہ "میں ایسا نہیں کر سکتا" محض ایک بزدلانہ فقرہ ہے ہر شخص ہر کام کر سکتا ہے اور شکست دوبارہ نئی فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے بشرطیکہ مسلسل جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے۔ ***

سیب کا سبق

ایک ٹن سیب سے کتنا عرق نکالا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی پھلوں کا ماہر آپ کو بتائے گا کہ ۷۰۰ سے ۷۵۰ کلوگرام تک۔ مگر سیب میں حقیقتاً اس سے بہت زیادہ عرق ہوتا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ موجودہ ذرائع کے تحت جب ہم سیب کو مکمل طور پر نچوڑ چکے ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ٹن میں ۱۰۰ سے ۱۲۰ کلوگرام تک عرق باقی رہتا ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے کولھو اچھے نہیں ہیں۔ نہیں۔ اگر ہم سب سے طاقتور برقی کولھو استعمال کریں جب بھی عرق کی مقدار میں بس برائے نام ہی فرق آئے گا۔ سیب کے اندر بچا ہوا عرق پھر بھی ہمیں حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیب کے خلیوں کا چھلکا بے انتہا دباؤ کے تحت بھی ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اور کولھو میں پس جانے کے باوجود اس کا عرق خلیوں کے اندر محفوظ رہتا ہے موجودہ حالت میں دباؤ اور طاقت کا اضافہ اس مسئلہ کو حل نہیں کرتا۔

یہ سیب کا قصہ ہے مگر اسی کے اندر آپ قوموں کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک قوم وہ ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی دباؤ کی زد میں آجائے تو آخری حد تک نچڑ کر رہ جاتی ہے۔ مگر زندہ قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگر وہ ظلم و ستم کے کولھو میں پیل دی جائیں جب بھی۔ سیب کی طرح، ان کے اندر زندگی کی رمق باقی رہتی ہے اور موقع پاتے ہی وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

زیر نظر کتاب (لیٹ گاڈ بی ٹرو) عیسائیوں کی ایک عالمی تنظیم کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس کا نام "خدا سچا ٹھہرے"، نئے عہد نامہ کے باب "رومیوں کے نام خط" (۳:۴) سے لیا گیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ میں ایک کروڑ تین ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا۔ ہمارے پیش نظر دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۵۲ میں ۲۵ لاکھ کی تعداد میں چھپا تھا۔

"مقدس تثلیث" عیسائی مذہب کا مرکزی اور بنیادی عقیدہ ہے۔ کروڑوں لوگ اس کو سب سے بڑی صداقت سمجھتے ہیں۔ اس عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ باپ، بیٹا، روح القدس تینوں یکساں طور پر خدائی طاقت کے مالک ہیں۔ تینوں الگ الگ ہو کر بھی ایک ہیں اور ایک ہو کر بھی تین ہیں، ظاہر ہے اس قسم کا ایک عقیدہ انسانی عقل کی گرفت سے باہر ہے۔ کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ اس قسم کا پراگندہ اصول خدا کا دیا ہوا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا پراگندگی کا خالق نہیں ہے (کرنتھیوں کے نام ۱۴: ۳۳)

تثلیث کا عقیدہ قدیم بابلیوں اور مصریوں میں اور دوسرے مذہبی حلقوں میں پایا جاتا تھا۔ مسیح کے بعد عیسائیوں نے انھیں سے اس کو لے لیا۔ (۱) دوسری صدی عیسوی کے ترتولین نے، جو قرطاجنہ میں رہتا تھا، لاطینی لفظ (TRINITAS) کو رائج کیا۔ یہی لفظ انگریزی میں (TRINITY) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ کسی مقدس کتاب میں نہیں آیا تھا۔ (۲) اس کے بعد تھیوفیلس نے اس کو یونانی میں رائج کیا۔ اس کا زمانہ بھی دوسری صدی عیسوی کا ہے۔ چوتھی صدی میں ۳۲۵ء میں عیسائیوں کی ایک کونسل شاہ قسطنطین کے تحت نیقیا (ایشیائے کوچک) میں ہوئی۔ اور اس نے تثلیث کو عیسائیت کا سرکاری عقیدہ قرار دے دیا۔

حیرت کی بات ہے کہ تثلیث کا عقیدہ، اس قدر اہم ہونے کے باوجود انجیل میں موجود نہیں۔ انجیل کے چار مقدس ترین ابواب (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) اس کے بیان سے خالی ہیں۔ چند حوالے جو دئے جاتے ہیں وہ بالکل ناکافی ہیں:

میں اور باپ ایک ہیں (یوحنا ۱۰: ۳۰)

وہ جو جسم میں ظاہر ہوا (تیمتھیس ۳: ۱۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مبہم الفاظ سے اتنا بڑا عقیدہ اخذ نہیں کیا جا سکتا جس کو تثلیث کہتے ہیں۔ ساری انجیل میں صرف ایک آیت اس مفہوم کی ہے۔ مگر کتاب کے مصنف نے ثابت کیا ہے کہ وہ الحاقی ہے۔

یہ آیت یوحنا کے عام خط میں ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:
"اور گواہی دینے والے تین ہیں۔ باپ، کلمہ، روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں۔ (۵: ۷)

اگرچہ یہ آیت بھی "خدائی" کی سہ گانہ تقسیم کو ثابت کرنے کے لئے پوری طرح کافی نہیں، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ وہ بھی انجیل کے قدیم نسخوں میں موجود نہیں۔ اسی سے ثابت ہے کہ یہ الحاقی ہے اور بعد کو اس کے متن میں ملائی گئی ہے۔

مصنف نے اس کو "خدا کے کلام میں اضافہ کرنے کی ایک نمایاں مثال" (صفحہ ۱۰۳) کہا ہے۔ اس نے یونانی زبان کے عیسائی عالم بنجمن ولسن کا قول نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:
"یہ آیت انجیل کے قدیم نسخوں میں سے کسی بھی نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ یہ نسخے پندرھویں صدی سے پہلے لکھے گئے تھے۔

LET GOD BE TRUE
WATCHTOWE BIBLE AND TRACT SOCIETY
BROOKLYN, NEW YORK, 1952, pp.320

کسی بھی یونانی عیسائی مصنف نے اس آیت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قدیم لاطینی عیسائیوں کی تحریریں بھی اس سے خالی ہیں۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ فقرہ جعلی ہے"۔ (۱۰۳)

بائبل کی تاریخی حیثیت کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ اس کی ۶۶ کتابیں سولہ صدیوں میں تین درجن افراد کے ہاتھ سے لکھی گئیں۔ موسیٰ نے اس کی پہلی تحریر ۱۴۰۵ ق م میں لکھی۔ اور سب سے آخر میں یوحنا کے خطوط ۹۰ء میں لکھے گئے۔ بائبل کے آخری حصہ کی تحریر کے ۱۹۰۰ برس بعد ہم کیسے جانیں کہ یہ تمام حوالے اور انتسابات صحیح ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ بائبل کے ابتدائی مرتبین کو خدا کی طرف سے الہام ہوا تھا تب بھی اس کا کیا ثبوت کہ آج بھی وہ محفوظ شکل میں ہے کیونکہ "بائبل کی کوئی بھی تحریر آج موجود نہیں ہے"۔

مصنف کا مقصد لوگوں کو بائبل سے دور کرنا نہیں بلکہ اس کے قریب لانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بائبل اپنی موجودہ شکل میں آج کے انسان کو اپیل نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک وہ خدائی کتاب ہے۔ اور اصلاً اسی طرح حق ہے جس طرح خدا حق ہے۔ مگر انسانی آمیزش نے اس کو لوگوں کی نظر میں بے اعتبار بنا دیا ہے۔ اس لئے جدید انسان کو دوبارہ بائبل سے قریب لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ملاوٹی اجزار کو اس سے الگ کر دیا جائے۔

مصنف کی یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ مگر یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ بائبل کے صحیح اور غلط اجزار کو جانچنے کے لئے معیار کیا ہوگا۔ کیا انسانی عقل۔ ظاہر ہے کہ خدائی کلام کو انسانی معیار سے جانچا نہیں جا سکتا۔ خدائی کلام میں اگر آمیزش ہو جائے تو اس کو دوسرے خدائی کلام ہی کے ذریعہ جانچا جا سکتا ہے نہ کہ انسانی عقل کے ذریعہ۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں دفاتر کا نظام

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں دفاتر کا نظام رائج کیا۔ ابتداءً خلفار نے محرری کے لئے عربوں کے علاوہ موالیوں اور عجمیوں سے مدد لی۔ اس وقت ہر صوبہ میں محصول کا حساب کتاب وہاں کی مقامی زبانوں میں ہوتا تھا۔ عراق و ایران میں فارسی، شام میں یونانی اور مصر میں قبطی۔ بعد کو جب عربوں نے اس فن کو سیکھ لیا تو وہ اس ضرورت کو پورا کرنے لگے۔ عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کے زمانہ تک تمام محصولات کا حساب عربی زبان میں [illegible] تھا۔ عراق میں صالح بن عبدالرحمٰن نے حجاج کی گورنری کے زمانہ میں وہاں کے دفتر محصولات کو عربی زبان پر منتقل کیا۔ شام میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں ابوثابت سلیمان بن سعد نے یہ خدمت انجام دی بصرہ میں بھی ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں یہ عہدہ ابن سیریوع فزاری حمصی نے حاصل کیا اور تمام کام عربی زبان میں ہونے لگے۔ تاہم یہ صرف محصولات کے دفاتر کا معاملہ تھا۔ جہاں تک فوجی دفاتر اور دیگر سرکاری تحریرات کا تعلق ہے وہ ابتدا ہی سے عربی زبان میں ہوا کرتے تھے۔

چڑیوں کی دنیا

بعض چڑیاں درمیان میں رکے بغیر تین ہزار میل تک اڑتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اتنی بلندی پر پرواز کرتی ہیں جہاں کوئی انسان مزید آکسیجن کا اہتمام کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

بیشتر چڑیاں اپنے انڈے بچے کرنے کے موسم کو خطِّ استوا کے شمالی حصہ میں گزارتی ہیں اور بقیہ موسم کو خطِ استواء کے جنوبی حصے میں۔ خشکی کی چڑیوں میں کوئی ایک مثال بھی ایسی معلوم نہیں ہے جو اس کے خلاف عمل کرتی ہو۔ تاہم سمندری چڑیوں میں بعض مثالیں اس کے خلاف پائی جاتی ہیں۔

ان چڑیوں نے نہ تو کسی درسگاہ میں جغرافیہ کا علم حاصل کیا ہے اور نہ مسافت کے فن سے وہ کوئی واقفیت رکھتی ہیں، اس کے باوجود پہاڑوں اور سمندروں کو طے کر کے ہزاروں میل دور کی منزل تک ان کا پہنچنا انتہائی حیرت انگیز ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ چڑیاں دور دراز مقام پر جا کر انڈے بچے کرتی ہیں اور ان کو وہاں چھوڑ کر چلی آتی ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر ٹھیک اسی راستہ سے سفر کرتے ہیں جس سے ان کے والدین نے سفر کیا تھا اور بغیر کسی رہبر کے دوبارہ اپنے اصل مسکن میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس حیرت انگیز سفر میں ان کی رہنمائی کون کرتا ہے؟ چڑیوں کی سائنس کے ماہرین (ORNITHOLOGISTS) اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔

"STRONG INSTINCTS"

The birds' sense of direction is most exciting extremely important phenomenon. We now where migratory birds spend the winter and they travel.

ہندستان میں ۲۵۰۰ قسم کی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۵۰۰ قسمیں مہاجر (MIGRATORY) ہیں۔ یہ وہ رنگارنگ مسافر ہیں جو ہزاروں میل دور سے پہاڑوں اور سمندروں کو طے کر کے سردیوں کے موسم میں ہمارے ملک میں آتے ہیں۔ یہ مہاجر چڑیاں شروع ستمبر سے لے کر مارچ کے آخر تک ہندستان کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔ اپریل میں گرمیاں شروع ہوتے ہی یہ پردار سیاح اپنے وطن کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ رن کچھ کا صحرا ان کا پسندیدہ مقام ہے۔

چڑیوں میں کچھ اقسام ایسی ہیں جو ایک ہی جگہ ہمیشہ رہتی ہیں۔ مگر ایسی اقسام بھی ہیں جو مقامی طور پر اس قسم کی ہجرتیں کرتی ہیں۔ مثلاً بعض چڑیاں خاص موسم میں میدانوں میں رہتی ہیں اور خاص موسم میں پہاڑوں پر چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے برعکس۔ یہ ہجرتیں دو مقصد کے لئے ہوتی ہیں۔ غذا کی تلاش یا انڈے بچے کرنے کے لئے مناسب موسم۔

چڑیوں کی یہ ہجرت اتنے صحیح وقت پر ہوتی ہے کہ قدیم زمانے میں بعض مہینے ان مہاجر چڑیوں کے نام پر رکھے جاتے تھے۔

یہ بات کہ بعض چڑیاں اپنے سابقہ مقام پر واپس جانے کی خصوصی صلاحیت رکھتی ہیں، قدیم انسان کو بھی معلوم تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ٹیلی گراف کی ایجاد سے پہلے کبوتروں کو دور دراز مقام پر پیغامات بھیجنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

ہر سال ستمبر کے مہینہ میں کروروں مہاجر چڑیاں ہمالیہ کے اس پار سے ہندستان آتی ہیں تاکہ یہاں جاڑے کا موسم گذاریں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو وسط ایشیا، مغربی ایشیا، ایران، افغانستان، تبت، روس، سائبیریا، یورپ سے آتی ہیں تاکہ یہاں پہنچ کر غذا اور مسکن حاصل کریں۔ سفر کے دوران انھیں ٹھیک ٹھیک علم رہتا ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ وہ عام طور پر رات اڑتی ہیں۔ وہ ساڑھے پندرہ ہزار سے لے کر ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی تک اڑتی ہیں۔ ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہ ہزاروں میل کا راستہ طے کرتی ہیں۔ اکثر چڑیاں چھ یا آٹھ گھنٹہ کے بعد "بریک جرنی" کرتی ہیں۔ بعض چڑیاں (مثلاً ایسٹرن گولڈن پلوور) جو مغربی الاسکا اور شمالی سائبیریا میں انڈے بچے کرتی ہے، ہندستان تک ۵۰۰۰ میل کا مسلسل سفر کر کے پہنچتی ہے اور راستے میں کہیں نہیں ٹھہرتی۔ اسنائپ کی ایک قسم جو جاپان میں انڈے بچے کرتی ہے اور جاڑے کا موسم مشرقی آسٹریلیا اور تسمانیہ میں گزارتی ہے، سب سے بڑی "نان اسٹاپ" پرواز کرتی ہے۔ وہ درمیان میں کہیں رکے بغیر تین ہزار میل تک اڑتی چلی جاتی ہے۔
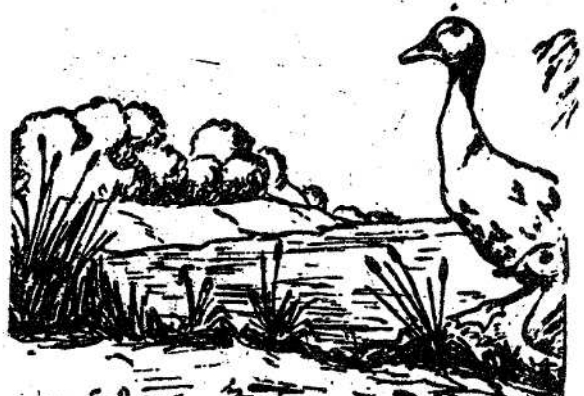
یہ چڑیاں اکثر اتنی بلندی پر اڑتی ہیں کہ کوئی انسان مزید آکسیجن کا اہتمام کئے بغیر وہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایشیائی واربلر (چھوٹی چڑیاں) کا ہندستان سے سائبیریا جاتے ہوئے دوربینی کیمروں سے فوٹو لیا گیا تو وہ ہمالیہ کے اوپر ۲۰۵۰۰ فٹ کی بلندی سے اڑتی ہوئی پائی گئیں۔

یہ چڑیاں رات کو اور خراب موسم میں سفر کرتے ہوئے کس طرح اپنے صحیح راستہ کو پالیتی ہیں جب کہ انسان کو اس قسم کے سفروں کے لئے راڈار کی ضرورت ہے، یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب ابھی تک جدید علما معلوم نہ کر سکے —— ایک نظریہ یہ ہے کہ چڑیاں اپنے سر میں ایک قسم کا "پرولو پلازمک بایولاجیکل کمپاس" رکھتی ہیں۔ اور یہ ان کے لئے راڈر کی طرح کام کرتا ہے اور زمین کے مقناطیسی پول سے متحرک رہتا ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے کان کے اندرونی نالی پر دباؤ ان کو زمین کی گردشی قوتوں سے باخبر رکھتا ہے۔ مگر یہ سب قیاسات ہیں، جن کے حق میں کوئی سائنسی دلیل موجود نہیں۔ چڑیوں کے ماہرین نے مختلف مقامات پر مشاہداتی مرکز بنائے ہیں۔ ان کے ذریعہ چڑیوں کی ہجرت کے راستے اور ان کی عمر کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

مہاجر چڑیاں انسان کی بنائی ہوئی سرحدوں کو نہیں جانتیں۔ انھیں سفر کے قواعد و ضوابط کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ واحد قانون جس کی وہ بظاہر پابندی کرتی ہیں، وہ فطرت کا قانون ہے۔ مگر ابھی تک انسان کو نہیں معلوم کہ یہ فطرت کا قانون ہے کیا۔

جدید انسان کی تلاش

زیان فرانسس ایویل کی کتاب "مارکس یا مسیح کے بغیر" WITHOUT MARX OR JESUS ۱۹۷۰ میں فرانس میں شائع ہوئی۔ کتاب میں مصنف نے بوڈیلیئر کا قول نقل کیا ہے جس نے تجویز کیا تھا کہ انسانی حقوق کے اعلان میں دو مزید حقوق شامل کئے جائیں۔ ایک، آپ اپنی تردید کرنے کا حق۔ دوسرے کنارہ کشی کا حق۔ امریکی نوجوان آج اسی انقلاب کی طرف جا رہا ہے۔ ایک طرف وہ ایک ایسے سماج کو رد کر رہا ہے جس کا محرک صرف منافع ہو اور جس پر صرف اقتصادی امور کا غلبہ ہو۔ دوسری طرف اسے روایتی مذاہب پر بھی اطمینان نہیں۔ کیوں کہ اس کے نزدیک بہترین مذہب وہ ہے جسے آدمی خود دریافت کرے۔ امریکی نوجوان کے جدید رجحانات کے چند خاص پہلو یہ ہیں: اخلاقی قدروں کی طرف رجوع کرنے کا ذہن۔ خالص اقتصادی اور تکنکی سماجی مقاصد سے انکار، قدرتی ماحول کو تجارتی منفعت سے زیادہ اہم سمجھنا۔ مصنف کے الفاظ میں۔ "آج امریکہ میں ایک نیا انقلاب سر اٹھا رہا ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے لئے واحد راہ فرار پیش کرتا ہے یعنی یہ کہ ٹکنالوجیکل تہذیب کو بطور ایک وسیلے کے قبول کیا جائے نہ کہ بطور ایک مقصد کے۔ اور چونکہ ہمیں نہ اس تہذیب کی تباہی بچا سکتی ہے اور نہ اس کا استمرار، اسی لئے اس قابلیت کو بھی بڑھایا جائے کہ ہم اس تہذیب کو فنا کئے بغیر اسے ایک نئی شکل دے سکیں"۔

یہ ذہن جس کی نمائندگی اس کتاب میں کی گئی ہے، ایک ایسے آدمی کی بے چینی کی طرح ہے جسے خود اپنی بے چینی کا سبب معلوم نہ ہو۔ امریکی نوجوان مادی تہذیب سے، جس کی آخری نمائندگی مارکس نے کی، مکمل طور پر غیر مطمئن ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ اس "ماضی" کو دیکھنے لگا ہے جس کو اس کے باپ دادا نے چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہاں "ماضی" کی نمائندگی کرنے والی جو چیز ملتی ہے وہ عیسائیت ہے۔ عیسائیت اپنے موجودہ ڈھانچے کے ساتھ خالص علمی و عقلی ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ اس لئے وہ "مارکس" کے ساتھ "مسیح" کا بھی باغی ہو جاتا ہے۔ تاہم جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغاوت کے بعد وہ جس چیز کا طالب ہے، وہ اس کے اپنے الفاظ میں وہی چیز ہے جس کا جواب صرف مذہب کے اندر ہے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مجہول احساس کے ساتھ اسی چیز کی تلاش میں ہے جس کو مذہب کہتے ہیں۔ مصنف نے اپنی کتاب کا نام "نہ مارکس نہ مسیح" رکھا ہے۔ مگر باعتبار حقیقت اس کا نام ہونا چاہئے تھا "نہ مارکس نہ مروجہ عیسائیت"

انسان مذہب کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ مگر مذہب کی غلط نمائندگی اس کو دوبارہ مذہب سے دور لے جا رہی ہے۔ یہ ہے دورِ جدید کا سب سے بڑا المیہ۔

میڈالین ایم۔ او ہیئر، امریکہ کی مشہور ترین ملحد خاتون ہیں۔ وہ کھلم کھلا اپنے الحاد کی تبلیغ کرتی ہیں۔ پکے خدا پرست والدین کی یہ بیٹی اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے:

"مجھے ان کے اعتقادات کا علم تھا اور احترام بھی کرتی تھی۔ مگر ۱۳ سال کی عمر میں اتوار کا پورا دن انجیل پڑھتے رہنے کے بعد میں اس کی یکسر خلاف عقل باتوں سے متنفر ہو گئی"۔ ۷۲

آپ بیتی

نومبر کا مہینہ تھا اور رات کے تقریباً ۱۲ بجے کا وقت۔ طالب علم اپنے کمرہ میں سو رہا تھا۔ اس کی چارپائی کے پاس شلف میں مجلد کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ طالبعلم نے نیند کی حالت میں کروٹ لی اور اس کا ہاتھ شلف پر چلا گیا۔ اچانک وہ ایک چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو ہاتھ کی انگلی میں دانت دھنسنے کا نشان تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ "مجھے سانپ نے کاٹ لیا" وہ چلایا اور کمرہ کے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز سن کر قریب کے کمروں کے لڑکے بھی جمع ہو گئے۔ اس وقت طالب علم کا جسم پسینہ سے تر تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص نے علاج کی غرض سے نیم کی پتیاں لا کر دیں، تو وہ بے تکلف ان پتیوں کو کھا گیا اور اسے کڑوے پن کا احساس تک نہیں ہوا۔

وہاں ایک اور طالب علم تھا جس کا پورا خاندان طبیبوں کا تھا۔ اس نے آکر (مارگزیدہ) طالب علم کا ہاتھ دیکھا۔ اس کے زخم پر نظر ڈالی "دانت تو ضرور دھنسے ہیں مگر یہ دانت ......" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ڈنڈا لیا اور کمرے میں روشنی کر کے اس کو اندر سے بند کر لیا۔ جو لوگ کمرہ کے باہر کھڑے تھے انھوں نے اندر سے ڈنڈا پٹخنے کی آواز سنی تو انھوں نے سمجھا کہ وہ سانپ کو مار رہا ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ طالب علم کمرہ سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سانپ کے بجائے ایک مرا ہوا چوہا تھا جس کو وہ دُم سے پکڑ کر لٹکائے ہوئے تھا۔ "دیکھو یہ تھی وہ چیز جس نے تمہیں کاٹا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری انگلی کا زخم دیکھتے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ یہ سانپ کا کاٹا نہیں ہو سکتا۔ چوہے کے دانت اور سانپ کے دانت میں فرق ہوتا ہے لیکن اگر میں یوں ہی کہتا تو تمہیں یقین نہ آتا۔ اس لئے میں نے چاہا کہ پہلے چوہے کو پکڑ کر ماروں اور اس کے بعد تمہیں بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے۔"

یہ باتیں سن کر اور مرا ہوا چوہا دیکھ کر یکایک طالبعلم اٹھ بیٹھا۔ اب وہ بالکل اچھا تھا "مجھے یاد آیا" اس نے کہا "کل ہی میرے یہاں نئی نئی کتابیں جلد بن کر آئی ہیں نئی جلدوں میں لئی کی بو پاکر اکثر چوہے آجاتے ہیں اور وہی قصہ یہاں بھی پیش آیا۔"

وہی طالب علم جس پر چند منٹ پہلے موت کی بدحواسی طاری تھی اب بالکل ہشاش بشاش اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی علاج نہیں کیا گیا تھا۔ اس کو صرف یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ اس کو جس چیز نے ڈسا ہے وہ سانپ نہیں بالکل چوہا ہے۔

یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ ہماری قوم اس وقت اپنے مسائل سے اس قدر پریشان ہے کہ زندگی کا حوصلہ تک اس سے رخصت ہو رہا ہے مگر یہ پریشانی حقیقی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ اگر قوم کے دل میں یہ بات اتاری جا سکے کہ تمہارا مسئلہ چوہے کا مسئلہ ہے نہ کہ سانپ کا مسئلہ تو قوم کی حالت بالکل بدل جائے گی اور وہ حوصلہ اور اعتماد کی ان تمام نعمتوں کو دوبارہ پالے گی جن کو وہ موجودہ حالت میں کھو چکی ہے۔

محمد خالد اعظمی (پیدائش ۱۹۲۸)
اردو ولنیھو پریس۔ اسٹریٹ نمبر ۴
شاہدرہ، دہلی

اپنی رائے دیجئے

الرسالہ اب تک ڈائجسٹ کے انداز میں نکالا جاتا رہا ہے۔ اقتصادیات اور عام معلومات سے لے کر دینی اور علمی موضوعات تک مختلف عنوانات کے تحت چھوٹے چھوٹے مضامین درج کئے جاتے ہیں تاکہ تنوع باقی رہے۔

تاہم شروع سے کچھ دوستوں کی تجویز رہی ہے کہ ڈائجسٹ کا انداز ختم کر دیا جائے اور الرسالہ کو سنجیدہ دینی موضوعات کے لئے خاص رکھا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ عمومی قسم کے معلوماتی مضامین تو لوگوں کو دوسرے رسائل میں بھی پڑھنے کے لئے مل جاتے ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ اسلام کی صداقت پر آج کے ذہنوں کو مطمئن کیا جائے اور اسلام کی گہری معرفت پیدا کرنے والے مضامین شائع کئے جائیں۔

الرسالہ اب تک جس طرح نکلتا رہا ہے اس کی افادیت یہ ہے کہ ہر ذوق کا آدمی اس میں اپنی دلچسپی کی کچھ چیزیں پالیتا ہے۔ موجودہ ترتیب میں چونکہ عام موضوعات میں بھی کوئی نہ کوئی دینی اور اصلاحی ٹمس (TOUCH) دینے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لئے ان مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی آدمی کو ہلکی فکری غذا پہنچتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ خالص دینی و علمی مضامین بھی الرسالہ میں شامل رہتے ہیں اس لئے اپنی پسند کے فیچر دیکھنے کے بعد وہ دوسرے مضامین کو بھی پڑھ لیتا ہے جن میں زیادہ واضح اور براہ راست انداز میں دینی گفتگو کی گئی ہو۔

مذکورہ تجویز کے مطابق الرسالہ کو ترتیب دیا جائے تو وہ "رسالہ" کم اور "کتاب" زیادہ بن جائے گا۔ اس تبدیلی سے ممکن ہے کہ اس کی عمومیت پر کچھ اثر پڑے، مگر اسلام کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کا شوق رکھنے والوں کے لئے یقیناً اس کی افادیت بڑھ جائے گی۔

موجودہ زمانہ میں ایک اہم کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے لسانی اسلوب میں مرتب کیا جائے اور عہد حاضر کے فکری مستوی پر اس کو مدلل کیا جائے۔ اسی کے ساتھ امت کے اندر داعیانہ مزاج پیدا کرنا اور دین کا گہرا شعور ابھارنا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ یہ دوسرا کام اگرچہ موجودہ الرسالہ میں بھی مسلسل انجام دیا جا رہا ہے لیکن اگر تنوع کو ختم کر دیا جائے تو اس پہلو سے رسالہ کی افادیت یقیناً بڑھ جائے گی اور زیادہ وسیع طور پر اس کا موقع ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی علمی و فکری ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔

اب ایک قابل عمل صورت یہ ہے کہ الرسالہ کو ماہنامہ کے بجائے سہ ماہی کر دیا جائے۔ ہر تیسرے مہینہ کسی خاص اسلامی موضوع پر ۶۴ صفحات کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے اور اس کو خریدار حضرات کے پاس بھیجا جائے۔ گویا اس کی حیثیت ایک قسم کی سہ ماہی کتاب کی ہو نہ کہ ماہانہ رسالہ کی۔ متنوع مضامین کے مجموعہ کے مقابلہ میں سنجیدہ طبقہ کے لئے، ایک مرتب کتاب میں زیادہ علمی کشش ہوگی، اور فکر کی تعمیر و تہذیب کے لئے وہ زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

تجویز یہ ہے کہ یہ سہ ماہی رسالہ بدستور ۶۴ صفحات پر مشتمل ہو البتہ اس کے اوپر موٹے کاغذ کے ٹائٹل کا اضافہ کر دیا جائے اور سالانہ قیمت (چار اشاعتوں کے لئے) دس روپے رکھی جائے کیونکہ سہ ماہی بنانے کے بعد اس پر ڈاک ٹکٹ دو پیسہ کے بجائے ۲۵ پیسے کا لگانا ہوگا۔ نیز ٹائٹل کی وجہ سے بھی لاگت بڑھ جائے گی

الرسالہ کے قارئین کے سامنے یہ تجویز اس لئے پیش کی جا رہی ہے تاکہ وہ اپنی رائے دیں۔ لوگوں کی رائیں سامنے آنے کے بعد آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
JULY - 1977

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING. QASIMJAN STREET. DELHI 6 (India)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر "دفتر الرسالہ" 1502 قاسم جان اسٹریٹ